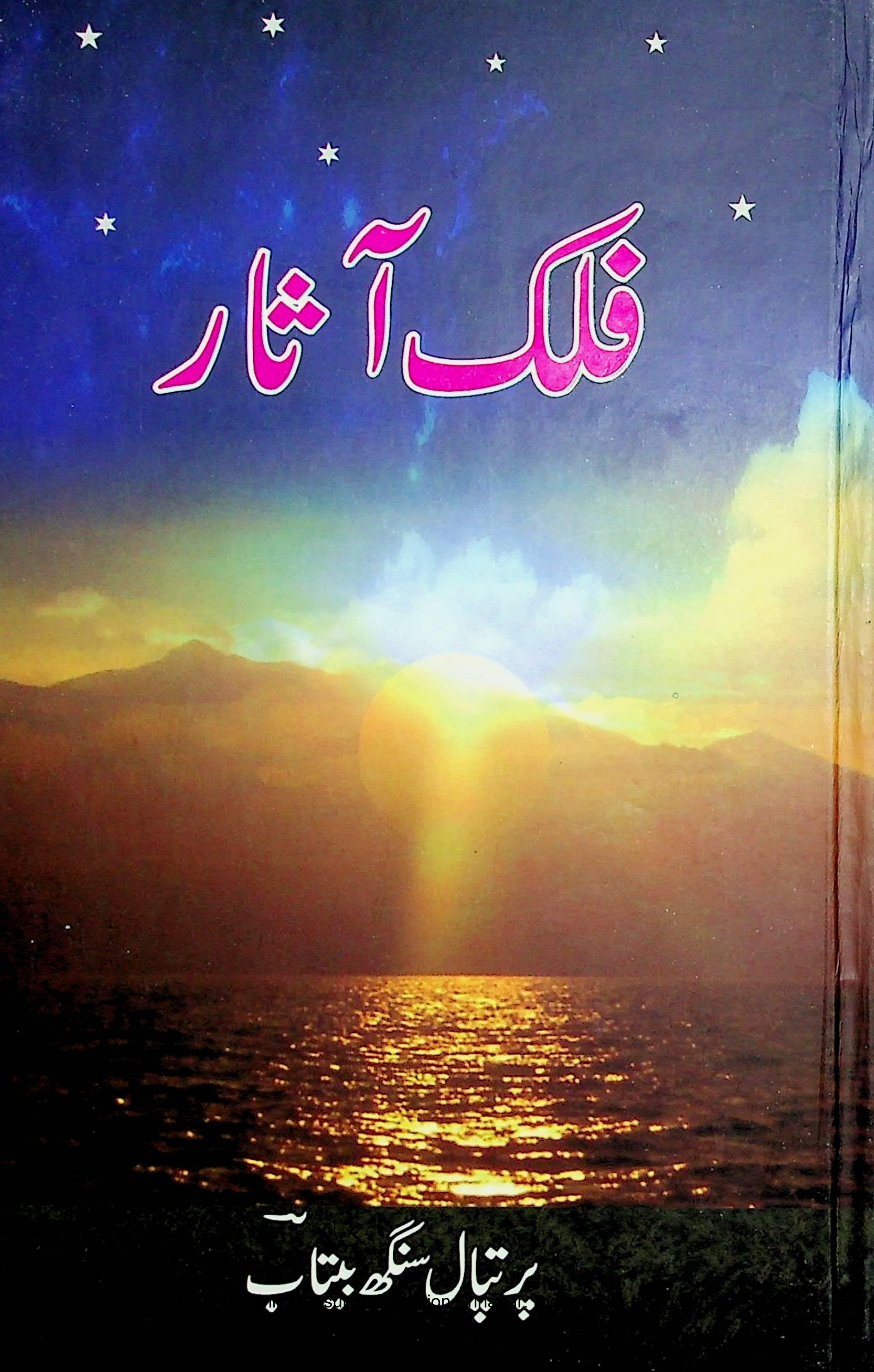


فلک آثار

پرتپال سنگھ بیتاب

فلک آثار

(شِعری مجموعہ)

پرتپال سِنگھ بیتاب

فلک آثار

(شعری مجموعہ)

پرتپال سنگھ بیتابؔ

سرسبز پبلکیشنز 134/E کھنیارا روڈ،
دھرم شالہ-176215 (ہماچل پردیش)

اِنتساب

انوُ

اور

چوُچوُ

کے نام

کتاب کا نام	:	فلک آثار
مصنف	:	پرتپال سنگھ بیتاب
تعلیم	:	ایم اے ایل ایل بی
ملازمت	:	آئی اے ایس (سبکدوش)
سنِ اشاعت	:	۲۰۱۴ء
سرورق	:	آشا شرما
تعداد	:	۱۰۰۰
قیمت	:	۵۰۰ روپے
کمپوزنگ	:	سارتھ کریئیشنز جانی پور جموں رابطہ: 9858667006
طباعت	:	نرمل آرٹ پرنٹرز 10/11 جے ڈی اے شاپنگ کمپلیکس، سُبھاش نگر جموں توی۔
ناشر	:	سرسبز پبلکیشنز 134/E کھنیارا روڈ، دھرم شالہ-176215 (ہماچل پردیش)

Falak - Aasaar

Author - Pritpal Singh Betab

Price - Rs. 500/- only

Publisher Sarsabz Publications 134/E Khanayara Road, Dharmshala-176215 (H.P.)

ملنے کے پتے:-

(۱) سرسبز پبلکیشنز 134/E کھنیارا روڈ، دھرم شالہ-176215 (ہماچل پردیش)

(۲) رائٹرس فورم A-69/1، ساؤتھ ایکس ترکٹا نگر جموں توی-۱۸۰۰۱۲ (جامعہ کے

طلسم ہزار شیوہ

بیدلؔ کا ایک مصرع ہے ''شعر آنست کہ معنی نہ دارد'' - بیدل کے اس قول یا MAXIM کو اگر آج کی نئی شاعری پر مکمل یا پھر نیم مکمّل طور سے وارد کیا جائے تو اس سے گہری شناسائی کی جو رفاقت ہمارے ذہنوں میں موجود ہے اس کی تخلیقیت بے اعتنائی کے دائرۂ گرد میں داخل ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور اس کا اعلیٰ اور ارفع مزاج فی الحقیقت اپنی وحدت کے وصف کے باوجود تجزیہ اور تحسین کے مافوق الفطرت انجام کی زد سے وابستہ نظر آتا ہے۔ آخر نئی شاعری کا التزام جذباتی اور ذہنی سطح پر لطف اندوز ہونے میں کیوں مانع ہے اس کا سیدھا سادا اور کیفیاتی جواب فنی اور تخلیقی عمل میں پوشیدہ ہے۔

نیا شاعر اپنی ذہنی اور قلبی واردات شعر سے اپنے قاری سے لگاؤ اور لگاوٹ کی سطح پر اجنبیت اور غیر صداقتی مظاہر کو دور کرنے میں آخر ناکام کیوں رہتا ہے۔ کیوں اس کی شناسائیت اور جذباتیت اپنی صداقت اظہار اور جرأتِ گفتار کے برمحل استعمال کے باوجود اپنے پڑھنے، سمجھنے اور مجاز وحقیقت سے برآشنا قاری سے بعد خاطر رکھتی ہے۔ شاید اس کی وجہ شاعر کی رعونت اور منقسم مزاجی ہو جس کے اثرات اس کی شاعری پر اثر آمیز ہوتے ہیں اور اس کے اور اس کے پڑھنے والوں کے مابین ایک انحطاطی خلا کو جنم دیتے ہیں۔ اس پس منظر میں ہم اگر پرت پال سنگھ بیتابؔ کے شعری وجدان کے خارجی قیود اور باطنی احتساب کی سطح پر روشن تبصرہ سے گذریں تو ہمیں یہ جاننے اور ماننے میں قطعی دقّت کا احساس نہیں ہوگا کہ ان کے اندر سے جو لاوا ایک آتش فشاں کی مانند پھوٹتا ہوا ہمارے رگ وپے میں سرایت کرتا ہے دراصل وہ ایسی ذہنی ہم آہنگی ہے جو تصوراتی اور حقیقی زندگی پر برحق ہے اور جس کی فضا اُنہوں نے ایسی چابکدستی سے خلق کی ہے کہ اس میں ایک قسم کی سادگی اور

سہل ہے میرؔ کا سمجھنا کیا
ہر سُخن اُس کا اِک مقام سے ہے
(میر تقی میرؔ)

سورج ہے نیا چاند نیا تارے نئے ہیں
یہ کیا پسِ دنیا ہے جو ہم دیکھ رہے ہیں

رات دن سے پرے ہے کیف آباد
جاگنا ہے جہاں نہ سونا ہے

چاہتا جب بھی ہے وہ مجھ سے مخاطب ہونا
سامنے سے مرے دنیا کو ہٹا دیتا ہے

رنگِ دنیا سے کیا غرض بیتابؔ
ہم تو رنگِ دِگر میں رہتے ہیں

مزاج کی، تحریر کی، تقریر کی
سوچ کی، عمل کی کچھ خامیاں تھیں
جنہیں میں اپنی خوبیاں سمجھتا رہا
جن پر مَیں ناز کرتا رہا
جو میرے لئے راحت بخش تھیں
اور دوسروں کے لئے تکلیف دہ
ایک عمر کے بعد محسوس ہو رہا ہے
کہ اگر مَیں نے اپنی خامیوں پر
وقتاً فوقتاً ناز نہ کیا ہوتا
بلکہ ان پر قابو پایا ہوتا
تو آج میں جہاں ہوں
اس سے بہت آگے ہوتا (شکست کا نشہ)

پورے اردو ادب میں عموماً اور شاعری میں خصوصاً معاشرتی ناہمواری کا عمل دخل رہا ہے

پرکاری در آئی ہے۔ کیوں نہ اِس کیفیت کو ان کے شعروں اور نظموں کے ٹکڑوں کے حوالے سے رد عمل کے طور پر مظہر کیا جائے۔

بظاہر بہت خوش ہوں
کہ لعل و جواہر کے بیانبار مَیں نے لگائے ہیں
بباطن البتہ اداس ہوں
کہ وہ لعل جس کی مجھے تلاش ہے
ہنوز میری دسترس سے پرے ہے
دراصل وہ پہاڑ ہی ابھی تک
میری آنکھ سے اوجھل ہے
جس میں وہ رگ ہے
جس رگ میں اس لعل کے
ہونے کی امید ہے (تیشہ بدست)

پہلے پہل گیرائی و گہرائی کم تھی، بہت کم
مگر مَیں اپنی نظموں کو
سلیقے سے بیاض میں سہیج کر رکھتا تھا
ایک ایک نظم کا اندراج
اور حساب باقاعدہ رہتا تھا
آج گیرائی اور گہرائی زیادہ ہے
مگر نظم اکثر کہیں بھی
کاغذ کے کسی بھی پرزے پر
تحریر ہو جاتی ہے (تیسری آنکھ کھلنے والی ہے)

صلاحیتوں کو تجسُّس کے ساتھ از سرِ نو دریافت کیا جائے تو ہمیں اس امکانی شعرفہمی کے نتائج پر پہنچنے میں ذرا سی بھی دِقّت نہیں رہتی کہ انہوں نے اپنے ذہنی ارتقا کے باعث خود کو بے وجود ثابت ہرگز ہرگز نہیں کِیا ہے بلکہ ان کا ادراک ان کے شعری تخلیق کے وجود کا حسین مگر جاندار جزو ہے۔ اگرچہ انہوں نے اپنے پیش رووں سے غیر اکتسابی طور پر یہ احساس اپنے پر وارد کِیا ہے لیکن یہ مسرت کا مقام ہے کہ ان کی یہ صلاحیت انسانی فطرت کے داخل سے جنم لینے کی ایک دلکش سعی ہے۔ آیئے ان کی اس معقولیت پسندی کو ان کے شعری رجحان کے حوالے سے تنقیدی ایمان کے سائے میں روشن کریں کہ موجودہ آفاق کا کوئی جز ایسا نہیں ہے کہ اس عمیق احساس کو واردات شعر بنانے میں مانع ہو۔

لحات کو کنی میں یہ بڑا سا ہیرا ہاتھ لگ گیا
ناتراشیدہ ہونے کی وجہ سے
کوئی اسے پہچانتا ہی نہیں
بڑے سے بڑے جوہری بھی
اسے یونہی سی چیز مان کر آگے بڑھ جاتے ہیں
کبھی سوچتا ہوں اسے تراش کر
اس کی شکل صورت کچھ ایسی بنادوں
کہ عقل کے اندھے ہی نہیں بلکہ
آنکھ کے اندھے بھی
اسے دیکھتے ہی پہچان جائیں
لیکن پھر یہ سوچ کر رہ جاتا ہوں
کہ جو اندھے ہیں
وہ اگر اسے پہچان بھی لیں تو بھی کیا
رہیں گے تو اندھے کے اندھے ہی　　(بیش قیمت)

اور ہمارے ادیبوں اور شاعروں نے معاشرہ اور ذات کے بنیادی اصول سے اپنے آپ کو وابستہ کرنے کے بعد جس طرح اس صورت کو واشگاف کیا ہے اور جس طرح اس تعلق اور ہم آہنگی کو شعر کی مثال بنایا ہے وہ ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ بقول سراج منیر ذات کے شکستہ ٹکڑوں کو ترتیب دے کر ذات کی وحدت کو جنم دینا شاعر و ادیب کا اولین مقصد رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے پرانے اور نئے شعرا کے سامنے ایک طرح کا المیاتی احساس پیشِ نظر رہا ہے جس کے ذریعے انہوں نے انسانی زندگی کا مآل اپنی تخلیقات میں شعور آمیز کیا ہے۔ شائستہ سطح پر تعلقات کو اس کے صحیح تناظر میں دیکھنا اور مرئی اور غیر مرئی تعلق کو دید شنید سے پیوست کرنا انفرادی اور اجتماعی مقام کے حصول کے لئے بھی ایک سعئ پیہم ہے۔

انسانی رشتوں کی برتری ذہن اور قلب دونوں کے لئے ایک مرتکز کے طور پر ابھرتی ہے۔ فرد اور معاشرے کے باہمی رشتوں کے حوالے سے مُحِبّ عارفی اپنے ایک مضمون میں یوں رقم طراز ہیں کہ اس سلسلے میں مغربی دانشوری دو انتہا پسندیوں کا شکار ہے۔ فردیت پرستی اور اجتماعیت پرستی، فردیت پرستوں کے نزدیک حقیقت انسانی فرد تک محدود ہے۔ فرد کا فطری حق ہے کہ اس پر معاشرہ کسی قسم کی پابندی عائد نہ کرے۔ اجتماعیت پرستوں کے نزدیک حقیقت انسانی معاشرے سے عبارت ہے۔ افراد معاشرے کی مشین کے بے روح پرزے ہیں۔ تقاضائے فطرت ہے کہ جملہ صلاحیتیں ہمیشہ بس معاشرے کی خدمت گزاری میں صرف ہوتی رہی ہیں کوئی معاشرہ اپنے افراد سے ضروری قربانیاں وصول کئے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔ لیکن ان قربانیوں کا جائز مصرف بس یہ ہے کہ اُن کی مدد کے بغیر معاشرہ اپنے افراد کی خِدمت گذاری میں لگا رہے۔ صالح معاشرہ وہی ہوگا جو اپنے ہر فرد کے لئے اس کے حصول کمال کے صالح امکانات کو ہر ممکن آزادی کے ساتھ انتہائی بلندیوں تک پہنچانے کی ہر ممکن سہولیت بہم پہنچائے۔

اب اس حوالے سے بیتابؔ کی مفکرانہ کاوشوں اور ان کی خلقی معقول پسندی اور غیر معتدل اور معتدل اجتماعیت پرستی اور مغربی افکار سے مملو فردیت پرستی کو تفتیشی کرشموں سے ان کی نظموں اور غزلوں کے اشعار کی ہیئت کے اجزا کا آخری حد تک تجزیہ کیا جائے اور ان کی شعری

جسم کو سجا کر نکلتا ہوں
لباس کی مدد سے
وہی انداز وہی مزاج وہی دم خم
اپنے جسم میں پیدا کرنے کی کوشش میں رہتا ہوں
سامنے والوں کی نظر پر نظر رکھتا ہوں (جسم لباس اور مَیں)

دوسروں کی کہانیاں سنتے سناتے
اس بات کا خیال ہی نہ تھا
کہ میرے اپنے اردگرد
کئی کہانیاں بُنی جا رہی ہیں
سُنی جا رہی ہیں، سُنائی جا رہی ہیں
اور جب تک اس بات کا پتہ چلا
میرے اردگرد
کہانیوں کے تانے بانے اتنے الجھ چکے تھے
کہ ان سے باہر نکل پانا
ممکن ہی نہیں تھا (مکڑ جال)

سوار اپنے اعصاب پر رات دن
رہی دوسروں کی خوشی ناخوشی

دنیا تو ہے بھرپور مگر ہم ہیں کہ ہر سمت
خود اپنے ہی اندر کا خلا دیکھ رہے ہیں

اک طلسمی چراغ ہے دنیا
ہے تو سب ہے نہیں تو کچھ بھی نہیں

جب تم میرے حق میں
سزائے موت کا حکم سنا رہے تھے
میرا دھیان کہیں اور تھا
جب تمہارے حکم سے مجھے پھانسی دی جارہی تھی
میرا دھیان اس وقت بھی کہیں اور تھا
آج ایک دنیا کے باشندے
بلکہ کئی دنیاؤں کے باشندے
میرے پاس آکر تمہارے خلاف بہت کچھ کہتے ہیں
خاص طور سے یہ
کہ تم نے مجھے سزائے موت دے کر
بہت بڑی غلطی کی ہے بلکہ گناہ کیا ہے
لیکن تمہارے خلاف ان تمام باتوں کے درمیان
میرا دھیان کہیں اور ہوتا ہے
یہ میرا دھیان اور یہ مَیں
ہم دونوں ایسے ہی ہیں۔

(یہ مَیں اور میرا دھیان)

جب جسم میں دم تھا
لباس کیسا ہے یہ فکر ہی نہ تھی
جسم کا اپنا مزاج تھا۔ ایک نخرہ تھا
مست ہاتھی کی سی چال تھی
اب جسم لاغر ہے
بڑھیا سے بڑھیا نئے سے نئے انداز کے
شوخ سے شوخ رنگوں کے خوبصورت لباس میں

سمجھ میں نہیں آتا کہ اکبرؔ الہ آبادی کا اس قسم کا طرزِ احساس آیا تصوّف کے ضمن اور سلسلہ میں انحطاط کا اشارہ یہ ہے یا پھر تصوف کی خوش طالعی کا استحقاق، تکریم مُلّا پرستی اور خواجہ حافظؔ کے سرے کبھی ایک دوسرے سے یافت نہیں ہوتے۔ آخر تصوّف کی خوش بختی کیا اپنے میں ایک نیا جہانِ معنی پوشیدہ رکھتی ہے۔ یا پھر خواجہ حافظؔ جیسے صوفی کی شعری بازگشت ہی ان کے دیوان کے حوالے سے ایک بھاری پتھر کو چوم کے چھوڑ دینے کی متحرک مستحکم اور مثبت کوشش ہے۔ خواجہ حافظؔ کے مستی بھرے اشعار کے علاوہ Epicurean Delight کے جنم داتا Epicureus کا حوالہ بھی تصوّف کے ردِ عمل Anti Establishment کے طور پر قابلِ اعتنا ہے۔ آخر تصوّف کی حقیقت ہے کیا۔ تمام صوفیائے کرام اس بات پر متفق ہیں کہ حق کا مشاہدہ صرف حق ہی کی نظر سے کیا جا سکتا ہے۔ انسان کی نظر کسی بھی صورت حق کے مشاہدہ کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ انسان کی اپنی انانیت اور انفرادیت مسائل تصوّف کے روایتی نظریے کے مماثل نہیں ہوسکتی بلکہ متصوفانہ اہمیت اور تصوّف سے طبعی میلان اور شغف اس کے شعری اظہار سے مطابقت نہیں رکھتے۔ آخر تصوّف کے روایتی بیان میں مذہبی سائیکی (ہندو مسلمان اور سکھ کی قید سے مُستزاد) خواہ وہ عشق خدا کے چند فیضانی لمحات ہی کیوں نہ ہوں اپنے پندار کو محبوب کے آگے ڈال کر عشق کا سب سے بڑا تجربہ حاصل کرنے کے مترادف سے بعید ہے۔ عشق اور تصوّف تقلید تنگ ظرفی منصور نہیں ہے بلکہ یہ جاننے کی ایک مستحکم خواہش ہے کہ قطرہ دریا کیسے بنتا ہے اور جو آدمی اپنی انا سے خلا کی طرح خالی ہوجائے اُس کا اندرون خالی خویش و باقی بہ حق کی مانند عکس ریز اور دعوٰے گزار کی مثال پیش کرتا ہے۔

تصوّف کی حیرت انگیز انکشافیت آخر ہے کیا۔ ظاہر ہے کہ اس کی اہم نوعیت عربی کی وحدت الوجود، سری شنکر آچاریہ کا ویدانت اور پلاٹی نس کی نوفلاطونیت ہے۔ تصوّف اردو شاعری میں پہلے پہل اوروں کے علاوہ خواجہ میر دردؔ اور غالبؔ کے کلام میں آشکار رہا ہے۔ بہت سے ماہرین کا دعویٰ ہے کہ تصوّف غالبؔ کا ذہنی ماحول تھا اس کا مزاج نہیں بلکہ بعض ناقدین کا تو یہ کہنا ہے کہ اس کا توحیدی ذوق فلسفہ اور تصوّف کی کوئی گہری بنیاد نہیں رکھتا۔ غالبؔ نے اپنی نظم و نثر میں اتنے مختلف اور متضاد دعوے کِئے ہیں کہ اگر ان سب کو یکجا کر کے دیکھا جائے تو محض انہی کی بنیاد پر اسے صوفی

قفلِ ابجد ہوں بس اک ترتیب سے
کھولنے والا ہو کھُل جاتا ہوں مَیں

تا حدِ نظر دیکھ لیا تو ہُوا محسوس
نظّارہ ابھی اور ہے درکار نظر اور

لمبے سفر کی گاڑی پر
سوار ہونا ہی نہیں چاہیے
دیر دیر تک ساتھ رہنے سے
جذباتی لگاؤ سا ہو جاتا ہے
پھر اترتے وقت
بچھڑتے وقت بڑی تکلیف ہوتی ہے
اچھا تو یہی ہے
کہ چھوٹے چھوٹے سفر کی گاڑیاں پکڑی جائیں
یاد ہی نہ رہے کب کس پہ چڑھے
کب کس سے اترے
کب کس میں داخل ہوئے
کب کس سے باہر آئے
نہ کوئی جذباتی لگاؤ نہ بچھڑنے کا غم
نہ ہو بانس نہ بجے بانسری (نہ ہو بانس نہ بجے بانسری)

اکبر الہ آبادی کا ایک بہت مشہور شعر ہے

ورزشوں میں کچھ تکلف ہی سہی
ہاتھ پائی کو تصوّف ہی سہی

ہی خیر کا ایک حصّہ ہے اور ترجیحی مذہبی عقیدے کی امید۔ وہ راہ سلوک کے تشیب وفراز سے نہ صرف آگاہ ہیں بلکہ اپنی شاعری کے نتائج کے اعتبار سے حقیقت کا جلوہ مجاز کی سطح پر بسا اوقات دیکھ لیتے ہیں۔ ان کا یہ پردہ طریقت سے انحراف کے طور پر نہیں ہے بلکہ شریعت کے عین مطابق ہے۔ ان کے پڑھنے والے جب جب اپنے طور پر منطقی نتائج اخذ کرتے ہیں وہ وحدت الوجود اور الحاد میں جو باریک سا تفاوت ہے اس کو باریک بینی کی وساطت سے موجودات ادراک کے تحت اقرار پذیر سمجھتے ہیں۔ بیتابؔ صاحب کے ہاں خالق ومخلوق، عابد ومعبود، شاہد ومشہود، دین ودنیا کا فرق بے حد باریک ہے بلکہ ایک نقشِ موہوم کی مانند ہے۔ کیوں نہ اعتراف کے اس موڑ پہ اگر ان کی نظموں اور غزلوں کے اشعار کے اقتباسات سے اس تحریر کو مزیّن کیا جائے۔

دنیاداری
پرکاری
ہشیاری
فن کاری
عیّاری
یہ سب تو باہر ہیں
مَیں باہر نہیں ہوں
مَیں تو اندر ہوں
اندر فقر ہے
مستی ہے
موج در موج بے باکی ہے
لاتعلقی ہے
لایعنیت ہے
اندر سب رُشنائی ہے باہر سب اندھیار

صافی اور موحد سے لے کر سنّی شیعہ عطا عشری، تفصیلی اور تبرائی تک اور ایک رند مشرب اور آزاد خیال انسان سے لے کر ملحد و کافر تک سبھی کچھ ثابت کیا جا سکتا ہے۔ غالبؔ کے بارے میں سلیم احمد نے کیا اچھی اور متوازن بات کہی ہے۔ ان کا ارشاد ہے کہ غالبؔ عرفا کے کلام سے حقیقت حقہ وحدت الوجود کرا اپنے دل نشیں کرتے رہتے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ منبع تصوّف حضرت علی کرم اللہ وجہہ اُن کے غلام تھے۔ بڑے در کا فیضان بھی بڑا ہوتا ہے تو پھر کیا تعجب ہے اگر بہ قول حالیؔ توحید وجودی ان کی شاعری کا عنصر بن گئی۔ اردو شاعری میں تصوّف کے حوالے سے دوسری بڑی آواز علامہ اقبالؔ کی ہے۔ ہر ایک کے علم میں ہے کہ علامہ اقبالؔ اپنے ابتدائی دور میں نہ تو وحدت الوجود کو کفر و زندقہ سمجھتے تھے اور نہ ہی تصوّف میں اسلامی یا غیر اسلامی امتیاز کے قائل تھے۔ لیکن اپنے شعری، ذہنی تدریجی ارتقا کے باعث انہوں نے آخر آخر میں اسے مسترد کر دیا گیا۔

پرت پال سنگھ بیتابؔ نے بھی اپنے پیش رووں سے خلاقانہ اثر قبول کیا ہے اور پلاٹی نس کے خیال مطلق کو تصوّف کے اصول سے بے خبری نہیں بلکہ شاعرانہ مضمون آفرینی کی مثال بنایا ہے۔ تصوّف اور مسائل تصوّف سے بیتابؔ کو جو دلی شغف ہے اور انہوں نے اپنے اشعار اور نظموں میں جس طرح متعدد مضامین کو باندھا ہے اور جس طرح متصوفانہ طریقے سے اپنی انانیت اور انفرادیت کو اپنے طبعی میلان سے روشن کیا ہے وہ ان کا دعوائے محض نہیں ہے کیونکہ وہ اپنے اندر سے خلا کی طرح خالی ہونے میں یقین نہیں رکھتے بلکہ اندرون حق کو ایک صوفی کی طرح واصل ہونے میں فیضانِ دِلی سمجھتے ہیں اور اپنی عشقیہ شاعری کو اپنے حقیقی تجربے کی آگ سے گزار کر ان مقامات تک لے جانے پر قادر ہیں، جو ان کے وجود کا ایک حصّہ ہے اور برائے شعر گفتن کی ذیل میں ہر گز ہر گز موعوٗد نہیں ہوتا۔ تصوّف ان کا نہ صرف ذہنی ماحول ہے بلکہ ان کا طبعی مزاج بھی ہے۔ وہ نرے صوفی صافی نہیں ہیں بلکہ اپنے تعلقی دعووں کو اپنے مذہب اور مسلک کے حوالے سے بنیاد بھی بناتے ہیں اور حقیقت وحدت الوجود کو اپنے دل میں اتارتے رہتے ہیں۔ یہ اس لئے بھی باعث تقلید ہے کہ جیسے مَیں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ بڑے در کا فیضان بھی بڑا ہوتا ہے۔ پرت پال سنگھ بیتابؔ کا یہ وصف ان کی شاعری میں اظہر من الشّمس ہے کیونکہ ان کے خیال میں ان کی ذاتی مسرّت کا عروج

قید خانے کے بڑے دروازے سے باہر نکلتے ہی
آزادی کی تمام خواہشیں گویا کافور ہو گئیں
باہر کا ناسازگار ماحول دیکھ کر
میں واپس زندان کی طرف
مڑا ہی تھا کہ زنداں کا بڑا دروازہ بند پایا
بلکہ زنداں کا بڑا دروازہ تھا ہی نہیں
بلکہ اس زنداں کا دور دور تک نام و نشاں ہی نہ تھا

(عمر قید کے دوران عمر قید کے بعد)

میں نہیں جانتا
کسی بحرِ بیکراں میں ہوں
یا کسی خلائے بیکراں میں
جانتا ہوں تو بس اِتنا
کہ کہیں عین درمیان میں ہوں
جہاں کوئی قطب نما کام نہیں کرتا
ہر قدم اک نئی سمت ہے
ہر نظر اک نیا افق ہے
اس وسعت لامحدود میں
سفر محض اک لفظ ہے
یہاں کچھ گذرا ہے نہ کچھ آنے والا ہے
کچھ پیچھے ہے نہ کچھ آگے
جو ہے سامنے ہے بہر طور سامنے
ہر سمت سامنے، سامنے فقط سامنے (رفت کیا چیز بود کیا شے ہے)

اندر میری جیت ہے باہر میری ہار

(میں یہاں نہیں ہوں میں یہاں ہوں)

اکثر سوچتا ہوں
بس یہاں سے وہاں ہو
بیچ میں کچھ نہ ہو
وقت بھی نہ ہو
ایک جھٹکے سے یہاں ایک جھٹکے سے وہاں
ایک دنیا سے دوسری دنیا
ایک کائنات سے دوسری کائنات
ایک لامکاں سے دوسرے لامکاں تک
اور بیچ میں سب غائب
فقط ایک سوچ فقط ایک جھٹکا
پلک جھپک اور سفر تمام

(پلک جھپک اور سفر تمام)

عمر قید کے دوران
آزادی کی خواہش تھی
آرزو تھی زندان سے باہر
بھری دنیا میں بے باک بے خوف گھومنے کی
آزاد پرندوں کی طرح اڑنے کی
آزاد جانوروں کی طرح
جنگل جنگل بے رکے سفر کرنے کی
لیکن سزا ختم ہونے پر

کرتے ہوئے اور کثرت آرائی میں وحدت کی جلوہ فرمائی کو نمایاں دم ساز کرتے ہوئے ان کی ایک تمام کی تمام غزل قاری کے سامنے رکھنے کی جرأت کر رہا ہوں جس سے یہ بخوبی واضح ہو جائے گا کہ عقل کی نظر سے دیکھنے اور دل کی نظر سے دیکھنے میں جو باریک سا تفاوت ہے اور جس فنی اور فکری خوبی کی مثال ان کی اس غزل کے اشعار میں موجود ہے اور جو احساسات اور جذبات کا اظہار شعوری کوشش کے بغیر ان کی اس غزل میں ہوا ہے وہ بے اختیار داد کے قابل ہے۔ اس میں بلا مبالغہ انہوں نے اپنا مطلب بے حد موثر انداز میں بیان کیا ہے اور جو شعری فضا اُنہوں نے اس میں تخلیق کی ہے وہ حیرت انگیز ہی نہیں بلکہ فکر انگیز بھی ہے۔ یہ غزل از دل خیزد بر دل ریزد کی بہترین مثال ہے۔

سوچتا ہوں کہ ہوا ہو جاؤں
قید سے آج رِہا ہو جاؤں

نئے موسم ہوں نیا عالم ہو
نئی ہستی ہو نیا ہو جاؤں

بھری دنیا میں رہوں شامل بھی
اور دنیا سے جُدا ہو جاؤں

دستکوں پر بھی رہوں بند کبھی
کبھی آہٹ پہ بھی وا ہو جاؤں

بندگی میں رہوں چاہوں جب تک
اور جب چاہوں خُدا ہو جاؤں

کاش تو میری دعا ہو جائے
اور مَیں تیری انا ہو جاؤں

نہ زمیں ہو نہ زمانہ بیتاؔب
مَیں خلاؤں میں خلا ہو جاؤں

ہم نے نظموں کے اقتباسات سے تو ذہنی درخشندگی اخذ کر لی مگر کیا یہ ضروری نہیں کہ ان کی غزلوں کے اشعار سے بھی اپنے آپ کو توقیر پذیر کریں اور بیتاؔب صاحب کی ظاہری اہلِ طریقت کے برعکس باطنی نقوش کے مظاہر اور تعبیری کثرت آرائی کے عمود کو عقلی اور منطقی وجود اور سطح پر اظہار کے عالم میں سفر آمیز کریں۔

پہنچتے ہیں سب راستے اُس تلک
وہ جس کا نہیں ہے کوئی راستہ

ہر لحہ کوئی اینٹ اکھڑ جاتی ہے جس کی
ہم لوگ اسی دیوار کے سائے میں کھڑے ہیں

دنیا تو ہے بھرپور مگر ہم ہیں کہ ہر سمت
خود اپنے ہی اندر کا خلا دیکھ رہے ہیں

سفر اک عمر کا ہے بے حاصل
کل جہاں تھے ہم آج بھی ہیں وہیں

مجھ سے ہٹ کر یہ اس طرح اُس کا
دیکھنا مجھ کو میرے ثانی میں

زندگانی غبارِ رفتہ ہے
عرصۂ مرگ ناگہانی میں

خانہ ایک ایک ہے نہاں خانہ
ایک دل کے ہزار خانے ہیں

ہے یہ کچھ طرح زمانہ کا اثر ظاہر میں
مگر اندر کی طرف رنگ دِگر ہے اپنا

پرتپال سنگھ بیتاؔب کے متصوفانہ پس منظر و پیش منظر کو عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے تصور

معرفت کا بیش بہا موتی کبیرؔ کا شبد اور شاہ عبدالطیفؔ بھٹائی کا ذکر الٰہی اور خواجہ میرؔ درد کا سچ مچ کے صوفی کی آواز اور پرت پال سنگھ بیتابؔ کا جوگیانہ وصال اور تت توم امی (میں وہی ہوں) کا روحانی فلسفہ اور عبودیت کی سرشاری سب ایک ہیں۔ حیرت کا مقام یہ ہے کہ پرت پال سنگھ بیتابؔ کے ہاں مذہبی شاعری، صوفیانہ شاعری کے مقابلے میں نہ کے برابر ہے۔ صوفیانہ شاعری میں ایک طرح کی جو آفاقیت واقع ہوتی ہے وہ مذہبی شاعری میں وسعت اور آزاد خیالی سے معدوم رہتی

گیان رتن کی کوٹھری چپ کر دینوں تال
پارکھ آ کے کھولئے کنجی وچن رسال (کبیر/213)

کاش وہ جوہر شناس
نہ جائیں
جو آنکھ پر عدسہ لگا کر
آبدار موتی پرکھتے ہیں
موتی کا مزاج
آب شناسی ہے
جسے صرف جوہری پرکھتا ہے شاہ عبدالطیفؔ بھٹائی/سری راگ 4

شیوہ نہیں اپنا تو عبث ہرزہ یہ بکنا
کچھ بات کہیں گے جو کوئی کان ملے گا خواجہ میرؔ درد

اے میرے خدا مجھ کو یہ توفیق عطا کر
جو دل پہ گزرتی ہے وہ اظہار میں آوے
(پرِتپال سِنگھ بیتابؔ)

میں کہ اک تشنہ لب مسافر
پانی کے ان خزینوں کے درمیان بھٹک رہا ہوں

پرت پال سنگھ بیتابؔ کا ازلی اور بنیادی نظمِ شعر جذباتی وابستگی اور فکر کے وسیلے اور حوالے سے خود کو از سرِ نو دریافت کرتا ہے۔ ان کے اشعار میں تخلیق سے تخلیق کی عدم موجودگی کا احساس امکانات اور موجودات کے کرب سے نہ صرف نفی عیاں ہے بلکہ وہ اپنے اشعار میں نہ صرف تماشہ ہیں بلکہ تخلیقی محرّکات کے جذب سے خود اپنے تماشائی بھی۔ ان پر وہ قول بڑی خوبصورتی سے صادق آتا ہے کہ تخلیق، تخلیق کار سے لکھواتی ہے اور تخلیق کار اپنے مشاہدات اور تجربات کو ایک حد تک بروئے کار لاتا ہے۔ بیتابؔ آئینہ ہی نہیں بلکہ آئینوں میں خوبصورت پیکر تراشی کا جمال آفرین عکس بھی ہیں۔ وہ صرف خود سے مکالمہ نہیں کرتے بلکہ اپنے پڑھنے والوں کو اس میں شرکت کا احساس بھی دلاتے ہیں۔ شاید یہ شعری وجدان کی وہ غیر مرئی سطح ہے جہاں شاعر اور شعر کا ادراک رکھنے والے اپنے تحفظات کے باوجود ایک دوسرے کی توسیع نظر آتے ہیں۔ یہ مقام تخلیق کی سطح پر بہت کم عیاں ہوتا ہے کہ قاری شعر کے توسط سے اپنے چہرے سے آشنائی حاصل کرے۔ پرت پال سنگھ بیتابؔ کی تخلیق ایک ماورائی جوہر سے کشید ہو کر قاری تک رجوع کرتی ہے اور بڑے غیر محسوس طریقے سے اس کے درک میں جلوہ فگن ہوتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ معرفت کا بیش بہا موتی ہر ایک انسان کے اندر موجود رہتا ہے اگرچہ اس کی دریافت مختلف پس منظر رکھنے والے افراد پر مختلف اوقات میں وارد ہوتی ہے۔ معرفت میں صدف جسم کے مترادف ہے اور اس میں حقیقت فی الحقیقت اس ابرِ نیساں کی مانند جو سواتی نکشتر میں ابر بہار کی بوند بن کر اس کے دہن میں موتی بنتی ہے۔ پانی کی ہر بوند کے مقدر میں موتی بننا نہیں لکھا ہوتا۔ معرفت میں متبادل نام کی کوئی شے موجود نہیں ہوتی لیکن اعتراف حقیقت کو مماثلت سے تعبیر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ظاہری، مذہبی روائتوں اور رسومات سے گیان یا پھر عرفان کا ادراک ممکن نہیں ہے کیونکہ منزلِ مقصود کو ادھر ادھر بھٹکنے سے کبھی بھی حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ آگ یہ جوالا انسان کے اندرون میں بھڑکتی ہے اور شعلہ ریز ہوتی ہے۔ اس پس منظر میں اگر کچھ ایسے شعراء کا کلام بیتابؔ کے شعری وجدان کے مماثل میں رکھ کر پڑھنے کی سعی کریں تو شاید سلطان باہوؔ کی شمشیر برہنہ کی مانند ہم پر یہ واضح ہو سکے کہ آخر بڑے لوگ بڑوں کی مانند سوچتے ہیں اور ان کا ذہنی آہنگ یکساں طور پر لوگوں کے دلوں میں جلوہ فگن ہوتا ہے۔

ہمرے من آ کار تُہار براجے
(پرِتپال سِنگھ بیتابؔ)

وہ چلا آتا ہے میرے اندر
اپنی مانند سجاتا ہے مجھے (پرت پال سنگھ بیتابؔ)

عشقِ مجازی اور عشقِ حقیقی کے جھگڑے اصل بندے کے جھمیلے کا باعث نہیں بنتے۔ اُس کی لو الگ ہی ہوتی ہے۔

من کنجر مہمنت تھا پھرتا گہر گنبھیر
دوہری تہری چوہری پڑگئی پریم زنجیر کبیرؔ/674

ماں جی میرا اونٹ
دوسرے اونٹوں کے ساتھ
شاخ صندل چرتا ہے
اس کے شتر غمزہ سے
پتہ نہیں چلتا
بظاہر وہ جگ کے ساتھ جگ جیسا
باطن میں
ساجن کے ساتھ چندن چرتا ہے شاہ عبدالطیفؔ بھٹائی/کھنبات-2

نہ ہم غافل ہی رہتے ہیں نہ کچھ آگاہ ہوتے ہیں
انہی طرحوں میں ہم ہر دم فنافی اللہ ہوتے ہیں
خواجہ میر دردؔ

بے ثباتی ہے جسم کو درکار
روح کو چاہیے ثبات الگ (پرِتپال سِنگھ بیتابؔ)

سوالات کے جواب میرے پاس نہیں ہیں
پانی کو ہاتھ میں لگا نہیں سکتا
بھیم، ارجن، نکل، سہدیو کے حشر کو جانتا ہوں
لہٰذا بھٹک رہا ہوں، بھٹک رہا ہوں
بھٹک رہا ہوں تشنہ لب

پرت پال سنگھ بیتابؔ

فنافی اللہ صوفیت کا اوج کمال، انا کی فنا، وحدت سے وصل اور ایکوں ایک ہو سکتا ہے۔

جب دل ملا دیا دیال سوں تب کچھ انتر ناہنہ
پالا گل پانی بھیا جوں ہریجن ہری ماہنہ کبیرؔ/706

کامل ڈولے نہ ڈولے
سالم اپنی منزل پر جا پہنچے
عالم احد سے مل کر ایک ہوئے
بالم نے آدسے ہی انہیں
بیش بہا بنایا تھا شاہ عبدالطیفؔ بھٹائی/کلیان 1

آئینۂ عدم ہی میں ہستی ہے جلوہ گر
ہے موجزن تمام یہ دریا حباب میں

خواجہ میرؔ درد

جوگی رے
تم کاہے الکھ جگاؤ ہو بھور سویرے
تم کیا جانو
ہم دن کس بدھ کاٹے
تمری لو لاگی ہے نرا کار سوں

نہ پوچھو کچھ ہمارے ہجر کی اور وصل کی باتیں
چلے تھے ڈھونڈنے جس کو سو وہ ہی آپ ہو بیٹھے

اس قسم کے صوفیانہ افکار ہمیں کم و بیش ہر اچھے غزل گو کے کلام میں مل جاتے ہیں۔ پرت پال سنگھ بیتاب کسی تخصیص کے حامل نہیں ہیں لیکن ان کے انفرادی تجربے اور موضوع کی رنگا رنگی انھیں دوسرے شعرا سے الگ کرتی ہے۔

جب دیوندر اسر نے اپنی ایک تحریر میں لکھا تھا کہ جب کوئی مصنّف ذات اور کائنات کے بیچ پھیلے ہوئے سوچ کے بیکراں خلا میں داخل ہوتا ہے تو ہم ایسی سچائی سے آشنا ہوتے ہیں جسے محض ذات کے حوالے یا تاریخی حالات کی رو سے ادراک کے دائرے میں لانا ممکن نہیں۔ لہٰذا جن باتوں پر زیادہ زور دیا جاتا ہے جیسے تلازمۂ خیال، تحلیل نفسی، شعور کی رو وغیرہ وغیرہ یہ سب بحث طلب ہیں۔ شاعری میں اور ان کی بنت میں جو ذہنی خلا ہے وہ ہر جگہ موجود ہے اور کہیں بھی موجود نہیں ہے کیونکہ وہ اگر ایک طرف طبعیاتی سطح پر حرکت پذیر ہے تو دوسری طرف اسی لمحے اس سے پرے غیر مرئی حقیقتوں کے اسرار کے بند دروازے پر دستک آزما ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ شاعر مکمل طور پر اپنی ذات اور تجربات سے ماورا نہیں ہوتا۔ اگر وہ اسے رد بھی کرتا ہے تو وہ اپنے تجربے کے حوالے سے رد کرتا ہے اور اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ بھی ایک طرح کا اظہار ذات ہے یعنی inverted self expression ہے۔ لیکن پرتپال سنگھ بیتاب نے اپنے تجربات کو اپنی ذات اور زندگی کے حوالے سے، جو بھی مواد اپنی شاعری میں استعمال کیا ہے، ان کی حد بندیوں کو زمان و مکان میں محصور ہونے کے باوجود اس طرح توڑ دیا ہے کہ وہ ہمارے ذہن کے نہاں خانوں میں داخل ہو کر ہماری ہی داستاں کا ایک حصّہ بن جاتے ہیں۔ ان کی نظموں میں خاص طور پر اس کی بازگشت سنائی دیتی ہے اور اس سے معنی کی نئی دنیاؤں کے در باز ہونے لگتے ہیں۔ انہوں نے اپنی نظموں میں اپنی زندگی سے مواد اخذ کیا ہے اور اسے وسیع اور ہمہ جہت معنوں میں استعمال کیا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں self reflexivity

میں جس کا طواف کرر ہا ہوں
وہ کسی اور کا طواف کرر ہا ہے
وہ جس کا طواف کرر ہا ہے
وہ آگے کسی اور کے طواف میں ہے
وہ کوئی اور جو بھی ہے
شاید یہ سب یا ہم سب کل ملا کر
کسی ایک کے طواف میں ہیں
یا شاید خود اپنے اپنے طواف میں ہیں
جو دوسروں کے ارد گرد
گھومتے ہوئے بلکہ منڈراتے ہوئے
دراصل خود اپنے ہی ارد گرد
گھوم رہے ہیں یا منڈرا رہے ہیں

(پرتپال سنگھ بیتابؔ)

گورو گرنتھ صاحب میں رقم ہے ''نانک نام ملے تاں جیواں تن من تھیوے ہریا''۔ محبوب سے وصل انسانی حیات کا نہ صرف خاصہ ہے بلکہ منتہا بھی بلکہ یہی زندگی کی سرسبزی کی دلیل بھی لیکن اس نشاط وصل میں آدمی کو خود اپنے اندر کے صراط مستقیم سے گزرنا ہوتا ہے تب ہی وصال الٰہی سے نشاط انگیز ہونے کی سعادت حاصل ہو سکتی ہے اور جس طرح سے یہ منزل آسانی سے سر نہیں ہو سکتی بالکل اسی طرح پرت پال سنگھ بیتابؔ کے ذہنی اور لسانی افق کو ایک ذرا سی اور روشنی اور وسعت درکار ہے۔ جس طرح محبوب سے وصل کو گداختگی لازم ہے کہ ہجر میں موت ہے۔ آپ کی نظروں سے پنجابی زبان کے مشہور شاعر شاہ حسینؔ کا یہ مصرع ضرور گذرا ہو گا، ''رانجھا رانجھا کردی نی میں آپو رانجھا ہوئی''، اور اسی مضمون کو خواجہ میرؔ درد نے بھی اپنے ایک شعر میں نظم کیا ہے۔ ان کا ارشاد ہے۔

مَیں سوچ رہا تھا
سب لوگ میری طرح
صفر سے نیچے درجۂ حرارت میں
منجمد ہوں گے اپنی اپنی پناہ گاہوں میں
کوئی باہر نکلنے کی جرأت نہیں کر رہا ہوگا
لیکن لگاتار جکڑن اور سکڑن سے
تنگ آ کر میں باہر نکلا
تو دیکھا کہ ایک دنیا
باہر گھوم رہی ہے
برف سے کھیل رہی ہے (برف موسم میں)

بھوت بنگلے کہلانے والے چند ایک محلّات
جن کی ایک ایک اینٹ
لمحہ لمحہ اکھڑ رہی ہے
بے بام و در کمروں جیسی چند ایک دیواریں ہیں
جن کو دیکھ کے لگتا ہے
کہ کبھی یہ عمارات کے حصّے رہی ہوں گی
ہم نہیں ہیں
مگر شاید ہم بھی ہیں پیچھے دور
اڑتے ہوئے غبار میں پھیلی ہوئی
اک فقط شرمندگی کی صورت (غبارِ رفتہ)

دل کش ترین مناظر دیکھ چکا ہوں
ایک سے ایک خوبصورت عورتوں سے مل چکا ہوں

داخلی معنویت تہذیبی بازیافت اور تعبیرِ نو کی صورت میں رونما ہوئی ہے۔ پرتپال سنگھ بیتابؔ کا وژن ان کی شخصیت کی شناخت میں معاون ثابت ہوتا ہے اور اسی سے فکر اور اظہار کے پیرائے تربیت پاتے ہیں اور احساس کی جہتیں بنتی ہیں۔ ان کی تلاش ذات اسی سفر اور اسی اظہار سے شروع ہوتی ہے اور بالآخر معاشرے کے انتشار، تہذیب کی تخریب اور کائناتی مدّ و جزر کی صورت میں تشکیل پاتی ہے۔ آیئے کیوں نہ اپنے اس قول کی روشنی میں ان کی شاعری سے اقتباسات پر نظر ڈالتے چلیں کہ یہ ادراک، اکتساب، تجزیہ، اطلاع اور تشریح کے مماثل ہوگا۔

وہ حقیقت کو سمجھتا ہی نہیں
خواب پر خواب دکھاتا ہے مجھے

راہ میں ہوتے ہیں خوش منظر بھی
اپنی ہی کم نظری رہتی ہے

ایک مسلسل دوڑ میں شامل ہم بھی ہیں
شوق نہیں یہ اک ذہنی بیماری ہے

زندگی تیرے اداکار تھے کیسے ہم بھی
سامنے آتے رہے ہیں کئی کرداروں میں

اِک زندگی ہماری طرح سے نہ ہو سکی
ہونے کو اس جہاں میں کیا کیا نہیں ہوا

قدم اگلا تھا پذیرائی کا
مرحلہ آ گیا پسپائی کا

برف موسم میں
اپنے اندر جکڑا ہُوا سکڑا ہُوا

کہیں ایسی کوئی جگہ مل جائے
تو میں یہ سب ضرور کروں گا (میں یہ سب ضرور کروں گا)

بجا کہ تم نے
مجھے شکست دے دی
میں ہار گیا
لیکن میں مرا نہیں زندہ ہوں
دوبارہ اٹھوں گا
پھر سے اپنی طاقت بٹوروں گا
لڑوں گا لڑائی جاری رکھوں گا
جب تک زندہ ہوں
یعنی جب تک مَیں مر نہیں جاتا
لیکن تم میری جس شکست کو
میری موت سمجھتے ہو
وہ میری موت نہیں ہے
میری موت تو میری فتح ہوگی
میری شکست نہیں (فتح باب)

حکمت کے گہر، علمی تجسس کی تسکین اور موضوع کے تاریک گوشوں کو منوّر کرنے والے لمحات اگر تہذیبی، ادبی اور فنی مطالبات اور ساختیات کی سوغات بن جائیں تو ایسے میں شاعر کا انفرادی جوہر شاداب اور تاب آمیزی کا استعارہ بن جاتا ہے اور یہ دریافت اس کو دوسرے انسانوں سے اور اپنے اندر کی پہلودار شخصیت سے ایک معیاری مکالمہ پر آمادہ کرتی ہے اور اس پر ذات اور کائنات کے ممکنہ امکانی دردستاویزی خطوط وا اور منکشف ہونے لگتے ہیں۔ پرِتپال سنگھ بیتابؔ نے اِن مخصوص مطالبات کے پیشِ نظر اپنے کلام میں ایسی معیاری رسائی بہم پہنچائی ہے جو سکہ بند ادبی

ہر قسم کے پھلوں کا ذائقہ چکھ چکا ہوں
پھر بھی منتظر ہوں
کسی ان دیکھے منظر کا
حسن کے کسی ایسے نمونے کا
جس کا جمال پچکا چوندھ کر دے
کسی ایسے ثمر کا
ابھی تک میری زبان
جس کے ذائقے سے ناواقف ہو
زندگی شاید اسی انتظار کا نام ہے
اور یہ انتظار شاید
زندگی کے ساتھ ہی ختم ہوگا (اِنتظارِ نادیدہ)

اس بھیڑ بھاڑ بھرے مہانگر میں
ایسی جگہ کہاں ہے
جہاں میں آزاد پنچھیوں کی طرح
اڑتا پھروں
درختوں سے لپٹ لپٹ کر
اونچی اونچی آواز میں رووُں ہنسوں
قدرت سے مکالمہ کروں
خود سنوں خدا کو سناؤں
میں جانتا ہوں کہ ایسا کرنے والے کو یہ مہذب دنیا دیوانہ ہی کہے گی
لیکن پھر بھی اس مہانگر میں
یا کسی بھی مہانگر میں

اے انا اتنا ساتھ دے میرا
موت سے پہلے مر نہ جاؤں کہیں

لمبے سفر کے بیچ میں
اک ذرا تھک کے بیٹھ گیا ہوں
مَیں سویا نہیں ہوں جاگ رہا ہوں
ہاں تھوڑا سا اونگھ رہا ہوں
ہم سفر آگے نکلتے ہوئے
میری طرف اس انداز سے دیکھ رہے ہیں
گویا سوچ رہے ہوں
کہ اس کی تو بس ہو گئی
لیکن مَیں جانتا ہوں
میری بس نہیں ہوئی
ابھی میرا سفر تمام نہیں ہوا
تھکان دور ہونے پر اٹھوں گا
پھر چل پڑوں گا اسی راہ پر (اِک ذرا تھک کے)

لڑکپن میں اور نوجوانی میں
مجھے اپنے والد کی اکثر باتیں
خاص طور سے نصیحتیں
بوسیدہ اور فرسودہ
معلوم ہوتی تھیں
بباطن بغاوت رہتی تھی
بظاہر اظہار کم کم تھا

روایات کے ساتھ ساتھ مستند آئین، بلاغت اور تہذیبی معنویت کی پیکری صورت ہمہ جہتی طرزِ احساس کے ساتھ اجاگر ہوتی ہے۔ انہیں ان حقائق کا مکمل ادراک اور عرفان ہے اور ان کی فکری سطح ان سے بے حد متاثر نظر آتی ہے۔ ان کے کلام کے شعری دریچے تازہ اور مہک بھری ہوا کے لئے ہمیشہ وا رہتے ہیں اور ان کا فن جذبے میں خلوص اور اظہار میں فنی اور حقیقی صداقت کے لِئے دل بر انداز رہتا ہے۔ وہ اس حقیقت سے بھی باخبر ہیں کہ ان کی ہنگامہ خیزی ان کی رجائیت پر دال ہے اور وہ Hope sustains life کے مصداق ایک بصیرت افروز مثال ہیں۔ وہ بے حد باخبر شاعر ہیں اور ان کا چراغِ آرزو، موضوع کی ہمہ گیری اور جذبے کی وسعت کے بے کراں دشت میں جلوہ گر رہتا ہے۔ ان کا ہر شعری منظر ایک خوشگوار حیرت کے ساتھ ہمارے دل کے دروازے پہ دستک دیتا ہے اور ان کی صلاحیتوں کا منہ بولتا اظہار ہے۔ ظاہری توصیف وتعریف سے قطع نظر ان کی ذہنی پختگی اس بات کی متقاضی ہے کہ ان کا فلسفۂ حیات محبت میں مرگ طلب کے اعتبار سے جامع، بلیغ اور مرکب ہے اور ان کے مثبت منفی، ادبی اور فنی رویوں کا اشاریہ۔

خدا کا شکر ہے کہ پرِتپال سنگھ بیتابؔ ادب میں لایعنی کلام کے خالق نہیں ہیں۔

آلام کی زد میں ہے مگر شاد بہت ہے
دل عہدِ غلامی میں بھی آزاد بہت ہے

منجمد ہم کو نہ دیکھو صاحب
اندر اک آگ لگی رہتی ہے

اب کسی دوست سے کوئی شکوہ نہیں
وقت کے ساتھ سب زخم بھرنے لگے

ہر لمحہ بدلتی ہوئی تصویر ہے یہ دنیا
آج اور ہی کچھ رنگ تو کل اور ہی عالم ہے

نہ جانے کہاں سے آجاتی ہے
کبھی اِس ورق پر کبھی اُس ورق پر
یہ تصویر میری البم کے قریب قریب ہر ورق پر
کبھی نہ کبھی اپنی نمائش کر چکی ہے
البم سے باہر
یاد کرنے پر
دماغ پر بہت زور دینے پر بھی
یاد نہیں آتا
کہ یہ تصویر کس کی ہے (ایک تصویر میرے البم میں)

میں نہیں جانتا
کسی بحرِ بیکراں میں ہوں
یا کسی خلائے بیکراں میں
جانتا ہوں تو بس اتنا
کہ کہیں عین درمیان میں ہوں
جہاں کوئی قطب نما کام نہیں کرتا
ہر قدم اک نئی سمت ہے
ہر نظر اک نیا افق ہے
اس وسعتِ لامحدود میں
سفر محض اک لفظ ہے
یہاں کچھ گزرا ہے
نہ کچھ آنے والا ہے
کچھ پیچھے ہے نہ کچھ آگے

آج مَیں اپنی بیٹی سے
قریب قریب قریب وہی سب کہتا ہوں
جو میرے والد کبھی مجھ سے کہا کرتے تھے
میری بیٹی بغاوت اندر دبائے نہیں رکھتی
بلکہ اگل دیتی ہے (خلا ہر لمحہ بڑھتا جا رہا ہے)

میری تنہائی میرا بہترین ساتھی ہے
اس کے سامنے مَیں بات بے بات رو سکتا ہوں
کھلکھلا کر ہنس سکتا ہوں
اپنے آپ سے باتیں کر سکتا ہوں
اپنی ذات کو اونچی آواز میں پکار سکتا ہوں
الف ننگا ہو سکتا ہوں
اپنے جسم سے پیار کر سکتا ہوں
بے شک، میرے چاہنے والے بے شمار ہیں
کچھ تو مجھ پر جان چھڑکتے ہیں
لیکن ان میں ایسا کوئی نہیں
جس کے سامنے مَیں یہ سب
جب چاہوں کروں اور اُسے کوئی تامل نہ ہو

(میری تنہائی میرا بہترین ساتھی ہے)

اپنی تصویر کے بند بڑے البم کو
وقتاً فوقتاً کھولتا ہوں
ایک ایک تصویر کو بغور دیکھتا ہوں
ایک تصویر جو میرے البم میں در اصل نہیں ہے

غزلیات

جو ہے سامنے ہے بہر طور سامنے

ہر سمت سامنے

سامنے فقط سامنے (رفت کیا چیز ہے بود کیا شے ہے)

محولہ بالا اقتباسات سے بات مظہرالشّمس ہے کہ پرتپال سنگھ بیتابؔ اپنے شعری انکشافات کی روشنی میں اپنے دماغی افق کی توسیع کرتے نظر آتے ہیں۔ان کی صلاحیتیں خود منہ بولتی ہیں اور مستقبل قریب میں وہ بے حد منور اور منفرد ثابت ہوں گے ایسی امید بھی ہے اور یقین بھی۔

پرتپال سنگھ بیتابؔ کے شعری افق کی دو اور پرتیں نہایت واضح اور غیر مبہم ہیں۔ایک تو وہ جس میں وہ سطحی اور بادی النظر میں ظاہری اشیا کو ہمہ رخی منطق کے ذریعے اپنی گرفت میں لینے کی سعی کرتے ہیں اور دوسری وہ جس میں وہ غالبؔ کی طرح دشت تمنا کے دوسرے قدم کا منظر پیش کرتے ہیں۔یہ دونوں مناظر ان کی اپنی ذات کی تفہیم کے حوالے سے ان کے شعری در و بست میں بہت واضح اور روشن ہیں۔شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی رجائیت اس کلبۂ احزاں میں بھی قنوطیت کی بجائے مسرت کی خوشگوار زیریں مگر نا معلوم لہروں کے اثرات قبول کرتی ہے اور زندگی کی کم مائگی کو ایک بے پناہ عشق انگیز احساس سے ممیز، پرت پال سنگھ بیتابؔ کا احاطہ رمز و شعر دنیاداری نہیں بلکہ دل داری ہے۔

کرشن کمار طورؔ

برف و باراں نِشانیاں اُس کی
بجلیاں لن ترانیاں اُس کی

وسعتیں ہیں اُسی کی ہفت افلاک
بحر و بر بیکرانیاں اُس کی

دھوپ اُس کی محبتوں کا جوش
بارِشیں گُل فِشانیاں اُس کی

اُس کے قدموں کی چاپ بادِ نسیم
بُلبُلیں خوش بیانیاں اُس کی

وہی دیتا ہے منزلوں کا پتہ
ہیں نِشاں بے نِشانیاں اُس کی

چرخ چکّر نِظام ہے اُس کا
دائمی حکمرانیاں اُس کی

مژدے بیتابؔ اُس کے آنے کے
مُنتظِر مژدگانیاں اُس کی

گنجینۂ معنی کا طِلسم اُس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالِب مِرے اشعار میں آوے
(غالِب)

اوّل مِرے مولیٰ مِرے ہاتھوں میں ہُنر اور
پھر چاہیئے تھوڑا سا دُعاؤں میں اثر اور

اور آبلہ پائی ہے تھکن اور سفر اور
ہے وادیٔ پُرخار سے آگے بھی ڈگر اور

ہے خواب نیا خواب کی تعبیر نئی ہے
عالم ہے نیا چاند ستاروں سے اُدھر اور

موسم ہیں کئی اور مِری راہ میں آگے
دے میری تمنّا کو شجر اور ثمر اور

تاحدِّ نظر دیکھ لِیا تو ہُوا محسوس
نظّارہ ابھی اور ہے درکار نظر اور

ہم ایک زمیں دیکھ نہیں پائے ابھی تک
ہے لاکھ زمین اور کئی شمس و قمر اور

کُچھ تو ہے مناظر میں طِلسمات کا عُنصر
اور اُس پہ کُچھ اپنا بھی ہے اندازِ نظر اور

دُنیا تو ریاکار ہے عیّار ہے مانا
خود ہم بھی ہیں بیتابؔ اِدھر اور اُدھر اور

سوچتا ہوں کہ ہوا ہو جاؤں
قید سے آج رِہا ہو جاؤں

نئے موسم ہوں نیا عالم ہو
نئی ہستی ہو نیا ہو جاؤں

بھری دُنیا میں رہوں شامل بھی
اور دُنیا سے جُدا ہو جاؤں

دستکوں پر بھی رہوں بند کبھی
کبھی آہٹ پہ بھی وا ہو جاؤں

بندگی میں رہوں چاہوں جب تک
اور جب چاہوں خُدا ہو جاؤں

شمع ہو جائے سراپا میرا
مَیں اندھیرے میں ضِیا ہو جاؤں

کاش تو میری دُعا ہو جائے
اور مَیں تیری انا ہو جاؤں

نہ زمیں ہو نہ زمانہ بیتابؔ
مَیں خلاؤں میں خلا ہو جاؤں

شہر در شہر کو بکو کی ہے
گفتگو ہم نے روبرو کی ہے

طوُر تک ہم پہنچ نہیں پائے
ہاں مگر دِل میں آرزو کی ہے

سفر اپنا ہے ایک صحرا کا
جستجو ایک آبجو کی ہے

ہم نے لمحہ بہ لمحہ مرتے ہوئے
زِندگی تیری آرزو کی ہے

چاک آتا نہیں نظر کوئی
ساری کاریگری رفو کی ہے

توُ سمُندر جو ہے تو ہم نے بھی
موج در موج آرزو کی ہے

خود سے باہر نِکل چلو بیتابؔ
یہ گھڑی خواہش نمو کی ہے

اِک مسلسل سفر میں رہتے ہیں
ہم تو بس رہگزر میں رہتے ہیں

کِسی انجان ڈر میں رہتے ہیں
جب سے ہم اپنے گھر میں رہتے ہیں

دِل میں رہتی ہے ایک مستی سی
وسوسے لاکھ سر میں رہتے ہیں

ہم بیابان میں مِلیں گے مِیاں
ہم کہاں بام و در میں رہتے ہیں

مانتے ہم خُدا کو ہیں بے شک
ناخُدا کے اثر میں رہتے ہیں

آشیانوں سے دُور کُچھ طائر
دم بدم بال و پر میں رہتے ہیں

چھائی رہتی ہے جِن پہ بے خبری
ہمیں ہیں جو خبر میں رہتے ہیں

رنگِ دُنیا سے کیا غرض بیتابؔ
ہم تو نگاہِ دِگر میں رہتے ہیں

ایک صحرا دِکھائی دیتا ہے
اُس میں دریا دِکھائی دیتا ہے

وہ جو رہتا ہے آنکھ سے اوجھل
اُس کا سایہ دِکھائی دیتا ہے

اپنے اور اپنے درمیان اکثر
کوئی پردہ دِکھائی دیتا ہے

جِس کو ساحِل سمجھ رہے تھے ہم
وہ جزیرہ دِکھائی دیتا ہے

وہ جو تھا اِک یقین خود پہ کبھی
پارہ پارہ دِکھائی دیتا ہے

بادلوں میں کبھی کبھی مُجھ کو
ایک چہرہ دِکھائی دیتا ہے

شہر کے بیچوں بیچ کُچھ بیتابؔ
دشت جیسا دِکھائی دیتا ہے

نت نئے رنگ میں نِکلتا ہوں
اپنے خوابوں کے ساتھ چلتا ہوں

تارے اپنے سفر میں رہتے ہیں
اور مَیں اپنی راہ چلتا ہوں

گُمرہی راہ خود نِکالتی ہے
نئے رستوں پہ جب نِکلتا ہوں

دُور رہتا ہوں شاہراہوں سے
اور پگڈنڈیوں پہ چلتا ہوں

پاؤں اپنے ہیں لغزشیں اپنی
خود ہی گِرتا ہوں خود سنبھلتا ہوں

برف رہتا ہوں سرد لمحوں میں
دھوپ کے ساتھ بہہ نِکلتا ہوں

مَیں ہی قوسِ قزح میں ہوں بیتابؔ
موسموں میں بھی مَیں بدلتا ہوں

رہ سکو جب تلک ہوا میں رہو
ورنہ واپس اُسی خلا میں رہو

سوئم عالم عجیب عالم ہے
کُچھ بقا میں تو کُچھ فنا میں رہو

رہو کُچھ اپنی موج میں بھی ضرور
کُچھ مگر اُس کی بھی رضا میں رہو

پاؤں پھیلاؤ چار سُو بے خوف
مگر اِمکان کی رِدا میں رہو

ہم بھی اپنی ادا میں زِندہ ہیں
خوش رہو تُم بھی جِس ادا میں رہو

پیکرِ خاک ہے یہ کیا شیوہ
آسماں میں اُڑو ہوا میں رہو

عالمِ عین میں رہو بیتابؔ
کبھی کُچھ دیر ماورا میں رہو

جانے کِس بات پر ہنسی آئی
ہاں مگر کوئی پل خوشی آئی

تیرگی آئی بے کسی آئی
زِندگی کب تجھے کمی آئی

راستے میں سخی ہزار آئے
نہ مگر اِک گداگری آئی

راز ہائے خودی سمجھ آئے
اور پھِر بے خودی چلی آئی

ایک بحرِ انا کِیا ہے عبور
پھِر کہیں جاکے بندگی آئی

ہو گئے ناگزیر تیغ و سِپر
خود بخود پھِر سِپہ گری آئی

آخری عُمر میں مگر بیتابؔ
زِندگی سے بیزاری آئی

حشمتوں کا زوال سامنے ہے
زلزلوں کا کمال سامنے ہے

ہے سوالِ بقا تعاقب میں
اور انا کا سوال سامنے ہے

چار جانب ہے ایک جمِّ غفیر
اور قحط الرّجال سامنے ہے

ہیں کہیں غیب میں جواب تمام
اور اِک اِک سوال سامنے ہے

کل جو بندے تھے آج ہیں وہ خُدا
بندگی کا زوال سامنے ہے

نہیں منزل کا کوئی نام و نِشاں
بس یہ رستوں کا جال سامنے ہے

جھیل کی مچھلیاں پریشاں ہیں
ہر طرف کوئی جال سامنے ہے

لبِ دریا ہوں دم بخود بیتابؔ
دم بدم اِنتقال سامنے ہے

نئے پانی میں ہاتھ ڈالتے ہیں
چلو اِک اور خواب دیکھتے ہیں

ہم کوئی اور چیز دیکھتے ہیں
ہم کہاں پتّھروں کو پوجتے ہیں

جب سے ہم ہو گئے سمُندر کے
روز اُبھرتے ہیں روز ڈُوبتے ہیں

اُونچے پربت میں ہے کہیں نیچے
جِس خزانے کو لوگ ڈھونڈتے ہیں

ہار جاتے ہیں جیت کر ہر روز
روز ہم اپنے من کو مارتے ہیں

وقت ہے دھُن کوئی چُرا لیجے
ابھی نغمے ہوا میں گونجتے ہیں

اپنی بے رنگیوں میں ہم بیتابؔ
رنگ قوسِ قزح کے دیکھتے ہیں

کیا کہیں کون کہاں تھا پہلے
جو وہاں ہے وہ یہاں تھا پہلے

یاد آباد ہے شہرِ ماضی
حال جو یہ ہے کہاں تھا پہلے

کب کہاں چھوٹ گیا یاد نہیں
دِل میں اِک جوش جواں تھا پہلے

یہ جو صحرا ہے یہاں کیسے ہے
ایک دریا جو رواں تھا پہلے

اب سفر ہے نہ کوئی زحمتِ سفر
سر پر اِک بارِ گِراں تھا پہلے

یہ جو دُنیا ہے بجا ہے بیتابؔ
مگر اِک اور جہاں تھا پہلے

مَیں چھوڑ آیا ہوں کب کا بے شک دیارِ رفتہ
مگر نہیں چھوڑتا مُجھے یہ خُمارِ رفتہ

قدم بڑھاؤں گا آگے رستہ نظر تو آئے
چھٹا کہاں ہے ابھی تلک یہ غُبارِ رفتہ

مِرے پروں کو نہیں وہ پرواز بننے دیتا
لدا ہُوا میری پیٹھ پر ہے جو بارِ رفتہ

نئی زمینوں میں پاؤں اپنے جما چکے ہم
کہاں مگر اعتبارِ رفتہ وقارِ رفتہ

مَیں آئینہ جب بھی دیکھتا ہوں یہ سوچتا ہوں
ہے میری آنکھوں میں کِس قدر اِنتظارِ رفتہ

حدِ نظر تک ہے اِس سے آگے دیارِ فردا
ہے چار جانب کھِنچا ہُوا جو حِصارِ رفتہ

سمیٹ تو لی ہے تُم نے بیتابؔ اپنی دُنیا
ہے وہ جو خوابوں میں جابجا اِنتشارِ رفتہ

خود سے ہی دوڑ لگی رہتی ہے
بس کہ اِک دربدری رہتی ہے

بُرے آثار کی سر پر گویا
کوئی تلوار تنی رہتی ہے

کُچھ طبعیت ہی مِلی ہے ایسی
ساتھ اِک غمزدگی رہتی ہے

راہ میں ہوتے ہیں خوش منظر بھی
اپنی ہی کم نظری رہتی ہے

میرے بھرپور تشخص میں کہیں
مستقِل کوئی کمی رہتی ہے

منجمد ہم کو نہ دیکھو صاحب
اندر اِک آگ لگی رہتی ہے

کوئی موسم بھی ہو اِس پربت پر
سال بھر برف جمی رہتی ہے

ہاتھ میں سارے ہُنر ہیں بیتابؔ
دل میں ہی بے ہُنری رہتی ہے

اب رضا کیا مِری انا کیا ہے
میرے قاتل یہ خونبہا کیا ہے

دوڑ ہے برتری کی چار طرف
ناروا کیا یہاں روا کیا ہے

کبھی فرصت مِلے تو سوچیں گے
زِندگی میں لِیا دِیا کیا ہے

سبھی قبریں ہیں بے نشان مِیاں
نام کیا ہے یہاں پتہ کیا ہے

برف موسم وہاں اُتر بھی چُکے
گرم اب بھی یہاں ہوا کیا ہے

ہاتھ اُوپر اُٹھے ہوئے ہیں مِرے
یاد یہ بھی نہیں دُعا کیا ہے

مانتا دِل سے ہوں اُسے بیتابؔ
سوچتا ہوں مگر خُدا کیا ہے

جزیرہ جزیرہ شجر در شجر
کِسے ڈھونڈتی ہے ہماری نظر

نِکل تو پڑے ہیں ہم آشفتہ سر
نہ آثار اچھے نہ اچھی خبر

ہمیں چیخے چِلّائے چُپ بھی ہوئے
ہُوا کیا کِسی پر ذرا بھی اثر

کوئی حیلہ حربہ نہ باقی رہا
بس اب تو بچے ہیں یہ تیغ و سِپر

تو کیا ہے جو دُنیا ہوئی اور تنگ
بہُت ہے کشادہ ہمیں دِل نگر

ہے جنگل گھنا گمرہی ہے بسیط
کہاں ہے وہ کہتے ہیں جِس کو خِضر

مسیحا کا ہم کو بھی ہے اِنتظار
وہ آئے گا لیکن نہ آیا اگر

زمیں بھِکشا دینے کو بیتاب ہے
پہاڑوں سے جوگی اب آؤ اُتر

مکاں لامکاں سب اُڑا لے گئی
ہوا تیز رفتار ایسی چلی

بظاہر چراغاں ہے چاروں طرف
بباطن ہے بے اِنتہا تیرگی

سوار اپنے اعصاب پر رات دِن
رہی دُوسروں کی خوشی ناخوشی

تھا پہلا قدم راہِ عِرفان کا
سمجھتے رہے جِس کو ہم آگہی

خُماری سی رہتی ہے بس رات دِن
نہیں جانتے ہم خودی بے خودی

بڑے شوق سے موج ساحل تک آئی
مگر آتے آتے فنا ہو گئی

پہنچتی ہے گُپ چُپ سمُندر تلک
زمیں دوز بہتی ہوئی اِک ندی

قدآور تو بیتابؔ ہم ہیں مگر
ہے احساس میں کوئی پستہ قدی

نہ آئی زمیں عُمر بھر زیرِ پا
رہے ہم ہمیشہ سے پا در ہوا

کِسی طور بچ کر نِکل آئے ہم
تھے رستے میں کتنے خُدا نا خُدا

کِسے بڑھ کے لیجے کِسے چھوڑیئے
ہوئے ایک جیسے روا نا روا

سمیٹیں کِسے کِس کو پھیلائیں ہم
نہ ہیں پاؤں اپنے نہ اپنی رِدا

وہ خود مر گیا آگ دے کے مجھے
مَیں زِندہ ہوں پھر بھی جلا ادھ جلا

کئی آندھِیاں آتی جاتی رہیں
چراغ اُس خرابے میں جلتا رہا

پہنچتے ہیں سب راستے اُس تلک
وہ جِس کا نہیں ہے کوئی راستہ

ترے پاس برکاتِ ہیں بے شمار
مِرے پاس بیتاب دستِ دُعا

جو سُنا تھا اور تھا لیکن جو دیکھا اور ہے
ہم نے بویا اور کُچھ ہم نے جو کاٹا اور ہے

زِندگی بادِ مخالِف میں مِری پرواز دیکھ
اور ہے بے شک نصیبہ سر میں سودا اور ہے

ایک سایہ روشنی میں ساتھ دیتا ہے مدام
تیرگی میں ساتھ دیتا ہے جو سایہ اور ہے

زِندگی نے کُچھ لِیا تو کُچھ دِیا بھی ہے مگر
ہم نے کھویا اور کُچھ واپس جو پایا اور ہے

راستے میں کل بھی تھے ہم آج بھی رستے میں ہیں
ایک صحرا طے کِیا ہے ایک صحرا اور ہے

ہم نے تو بے رنگیوں میں ہی گُزارہ کر لیا
رنگِ دُنیا اور ہے دِل کا تقاضا اور ہے

یہ جہاں دیکھا چلو اب وہ جہاں بھی دیکھ لیں
اِک تماشہ ہو چُکا ہے اِک تماشا اور ہے

آنکھ سے اوجھل ہے وہ بیتابؔ ہے زیرِ زمیں
ماتویں دنیا سے آگے ایک دنیا اور ہے

جو خواب میں آوے کبھی پندار میں آوے
ممکن ہے کِسی روز وہ آثار میں آوے

ہو ایسا کرِشمہ کہ جو گفتار میں آوے
وہ بات ہمیشہ مِرے کِردار میں آوے

بے مول بِکوں گا وہ خریدار اگر ہو
حسرت ہے بس اِک بار وہ بازار میں آوے

خوشبو میں مِلے گا وہ چبھن میں بھی مِلے گا
عِرفان کبھی گُل میں کبھی خار میں آوے

اے میرے خُدا مُجھ کو یہ توفیق عطا کر
جو دِل پہ گزرتی ہے وہ اِظہار میں آوے

یہ سُرخ و سِیہ سیمیں و زرّیں تو بجا ہیں
کچھ رنگِ انا بھی مِری دستار میں آوے

ساحل کی اِسے یاد ہی آتی نہیں بیتابؔ
رہ رہ کے سفینہ مِرا منجدھار میں آوے

مُجھ کو معلوم تھا مَیں اور سنور جاؤں گا
گھر سے نِکلوں گا تو ہر سمت بِکھر جاؤں گا

راز موجوں کے سمندر نے بتائے ہیں مجھے
یہاں ڈُوبوں گا کہیں اور اُبھر جاؤں گا

ابھی سُستاؤں گا کُچھ دیر اِسی دوراہے پر
بعد میں سوچوں گا دیکھوں گا کِدھر جاؤں گا

مَیں تو برزخ کے اندھیروں میں جلاؤں گا چراغ
مَیں نہیں وہ کہ جو موت آئی تو مر جاؤں گا

زِندگی یوں تجھے رہنے نہیں دوں گا بے رنگ
تیری تصویر میں کچھ رنگ تو بھر جاؤں گا

مَیں ہوں دریا ہے روانی مِری دائم بیتابؔ
کوئی سیلاب نہیں ہوں کہ اُتر جاؤں گا

تدبیر سے آگے کہیں تقدیر سے آگے
ہے میری نظر خواب سے، تعبیر سے آگے

اے کُنجِ قفس ہے مِری پرواز کہیں اور
ہے رقص مِرا پاؤں کی زنجیر سے آگے

مَیں دیکھ رہا ہوں تِری تصویر کو بے شک
مَیں سوچ رہا ہوں تِری تصویر سے آگے

اِک دشت میں آباد ہے اِک شہرِ تمنا
تخریب سے آگے کہیں تعمیر سے آگے

بیتابؔ سِتارے مِرے رستے میں کھڑے ہیں
دو چار قدم منزلِ تقدیر سے آگے

کچھ تو ہیں پیکر پریشاں آزروں کے درمیان
اور کچھ آزر پریشاں پتھّروں کے درمیان

سب خبر ہوتے ہوئے پیرِ مغاں ہے بے خبر
تشنگی کا غلغلہ ہے ساغروں کے درمیان

بھیڑ کی بے چہرگی میں ہیں کئی چہرے نہاں
چند سر والے بھی ہیں اِن بے سروں کے درمیان

آؤ سب اِک روز مِل بیٹھیں یہ سوچیں کیوں ہوئی
اِس قدر بے چارگی چارہ گروں کے درمیان

حادثوں کے شہر میں اِک حادثہ یہ بھی ہُوا
ایک شیشہ آ گیا ہے پتھّروں کے درمیان

جائے حیرت اِس نئی تہذیب میں موجود ہے
اِک پرانا سا کھنڈر اونچے گھروں کے درمیان

وہ تو بھاری پڑ گیا بیتابؔ اِک بچھو کا ڈنک
عُمر ورنہ کٹ چکی تھی اژدروں کے درمیان

نئے موسم نئے زمانے ہیں
اب تو بس ہم ہیں جو پُرانے ہیں

موت کے راستے ہزار سہی
زِندگی کے بھی سو بہانے ہیں

ابھی منزِل کہاں ابھی سرِ راہ
آنے والے کئی زمانے ہیں

خانہ ایک ایک ہے نِہاں خانہ
ایک دِل کے ہزار خانے ہیں

در و دیوار سی ہیں تصویریں
اندر ایسے نِگار خانے ہیں

خواہشوں کے دیار میں ہر سُو
قید خانے ہی قید خانے ہیں

یہ جو گنجان شہر ہیں دراصل
اندر اندر سبھی وِرانے ہیں

راہ میں ہیں حقیقتیں بیتابؔ
خواب ورنہ بہت سُہانے ہیں

ہیں جزیرے کُچھ اور پانی میں
ابھی کشتی بھی ہے روانی میں

ہم زمین و زماں کے مارے ہوئے
بس گئے آ کے لامکانی میں

عہدِ رفتہ گواہ تم تو رہو
درد کیا کیا تھے شادمانی میں

رہے ہم سے خفا خفا حاکم
ہم رہے اپنی حکمرانی میں

اپنی کمزوریاں مِرا ہمزاد
ڈھونڈتا ہے مِری کہانی میں

مُجھ سے ہٹ کر یہ اِس طرح اُس کا
دیکھنا مُجھ کو میرے ثانی میں

زِندگانی غبارِ رفتہ ہے
عرصۂ مرگِ ناگہانی میں

جھیل بے رنگ تھی مگر توبہ
رنگ کیا کیا تھے اُس کے پانی میں

گمرہی بیکراں ہوئی بیتابؔ
ایک صحرا کی بیکرانی میں

آبلہ پائی ہے اور عزمِ سفر ہے اپنا
کوئی منزل نہیں اِک راہ گزر ہے اپنا

ہم تو منزل سے بھی آگے کہیں پہنچے ہوتے
ساتھ اِک بوجھ مگر رختِ سفر ہے اپنا

دھوپ ہے ریگ ہے صحرا ہے مسلسل باہر
اندر آباد مگر سبز نگر ہے اپنا

ہے یہ کچھ طرحِ زمانہ کا اثر ظاہر میں
مگر اندر کی طرف رنگ دِگر ہے اپنا

تُم سے نمٹیں گے تو گھِر جائیں گے اپنے اندر
چکر اِک اور بھی اے شمس و قمر ہے اپنا

اب تو ساحِل کی تمنّا ہی نہیں ہے بیتابؔ
ایک منجدھار ہے اور ایک بھنور ہے اپنا

زِندگی تیرے اِلتفات مُجھے
یاد ہیں سارے حادثات مجھے

مَیں وہاں سے گزر چُکا ہُوں جہاں
ڈھونڈتے ہیں تغیرات مجھے

ہے یہ آوارگی مِری فِطرت
بے ثباتی میں ہے ثبات مجھے

مَیں اندھیرے میں دیکھتا ہوں ضِیا
ہے اماوس بھی چاند رات مجھے

موت نے مارنا بہُت چاہا
زِندہ رکھتی رہی حیات مجھے

خود سے بے زار کر نہ دیں بیتابؔ
کہیں ان کے تجربات مجھے

اِک فقط ساحِل تلک آتا ہوں مَیں
رَو میں جانے کیسے بہہ جاتا ہوں مَیں

منزِلوں کی جستجو میں بارہا
منزلوں سے آگے بڑھ جاتا ہوں مَیں

بھاگتا ہوں رات جِس جنگل سے دُور
صبح اُسی کو سامنے پاتا ہوں مَیں

کِس اُفق میں دفن ہو جاتا ہے دِن
ہر شب اِس اُلجھن کو سُلجھاتا ہوں مَیں

مر گیا جو شخص مُجھ میں اُس کا روز
پتھّروں پر نام کھُدواتا ہوں مَیں

قفلِ ابجد ہوں بس اِک ترتیب سے
کھولنے والا ہو کھُل جاتا ہوں مَیں

باربار اُس شہر کو بیتابؔ کیوں
با دلِ نا خواستہ جاتا ہوں مَیں

کوئی اُمید پھر جگاؤں کہیں
اِک دِیا غار میں جلاؤں کہیں

اے انا اِتنا ساتھ دے میرا
موت سے پہلے مر نہ جاؤں کہیں

گُمرہی تو ہی کوئی راہ نِکال
دشت میں شہر اک بساؤں کہیں

مَیں کہ صحرا میں اِک نوِشتہ ہوں
ڈر رہا ہوں بِکھر نہ جاؤں کہیں

دُور اُس آخری جزیرے پر
اپنے خوابوں کو جا بساؤں کہیں

ہے جو دریا رُکا ہُوا بیتابؔ
سوچتا ہوں اُسے بہاؤں کہیں

کیا مسیحا ہے مِرا کیسی شفا دیتا ہے
میرے سوئے ہوئے سب درد جگا دیتا ہے

دیکھتا جب بھی ہے وہ نگہِ کرم سے مُجھ کو
میرے تن من میں عجب آگ لگا دیتا ہے

ایسا دریا ہے وہ ہوتا ہوں مَیں جب اُس کے قریب
بِن پئے ہی وہ مِری پیاس بُجھا دیتا ہے

میرے خوابوں میں چلا آتا ہے جب جی چاہے
جب بھی آتا ہے مِری نیند اُڑا دیتا ہے

اُس کے اِنصاف کو مَیں مان بھی لیتا لیکن
فیصلہ اِک نیا ہر روز سُنا دیتا ہے

نفس پر ضبط ہے پورا تجھے لیکن بیتابؔ
کوئی لمحہ کبھی کمزور بنا دیتا ہے

میرے خوابوں کو سمندر میں بہا دیتا ہے
اِک جزیرہ مجھے ہر روز دِکھا دیتا ہے

ایک مُدت سے اُسے ڈھونڈ رہا ہوں باہر
وہ جو اکثر مجھے اندر سے صدا دیتا ہے

چاہتا جب بھی ہے وہ مُجھ سے مخاطب ہونا
سامنے سے مِرے دُنیا کو ہٹا دیتا ہے

آسمانوں میں دِکھا دیتا ہے جلوے کیا کیا
بادلوں میں مِری تصویر بنا دیتا ہے

کبھی کر دیتا ہے سنگین گُنہ میرے مُعاف
کبھی نا کردہ گناہوں کی سزا دیتا ہے

اپنی موجوں میں بہا لیتا ہے اکثر مُجھ کو
ڈُوب جاؤں تو کِنارے بھی لگا دیتا ہے

سفرِ وادیِ اسرار میں اکثر بیتابؔ
میں بھٹک جاتا ہوں راہ دِکھا دیتا ہے

یہ کہاں ہونگے جب نہ ہونگے ہمیں
ہم سے قائم ہیں آسمان و زمیں

اِک طِلسمی چراغ ہے دُنیا
ہے تو سب ہے نہیں تو کُچھ بھی نہیں

سفر اِک عُمر کا ہے بے حاصِل
کل جہاں تھے ہم آج بھی ہیں وہیں

کوئی آخر کہاں کہاں بھٹکے
آستانے ہزار ایک جبیں

ہیں گُزرتی ہوئی سی تصویریں
زِندگی ہے کہ پردۂ سیمیں

تھا کبھی اِک جہان پر بیتابؔ
اب یقین اپنی ذات پر بھی نہیں

نظم در نظم شعریات الگ
دشت و دریا ہیں کاغذات الگ

سفرِ زیست مَیں ترے صدقے
ہو گئی مُجھ سے میری ذات الگ

تھی فقط اِک الگ طرح اپنی
ہم الگ اور کائنات الگ

اِک زمیں پر مدام جنگِ وجود
آسماں سے مذاکرات الگ

بے ثباتی ہے جِسم کو درکار
رُوح کو چاہیئے ثبات الگ

بے طرح ہم رہے ہیں باہر بھی
تلخ اندر کے تجربات الگ

سائے ماضی کے ہیں ابھی ہمراہ
اور درپیش حادثات الگ

ہیں تقاضے کُچھ اور گردِش کے
ہیں کُچھ اِس دِل کی خواہشات الگ

اِک یہ احساسِ کمتری بیتاؔب
اُس پہ یادوں کے التفات الگ

باہر کی مُشکلات کو فی الحال ٹالیئے
پہلے جو گھر میں سانپ ہے اُس کو نِکالیئے

تنہائیوں سے گھر کو بچانے کے نام پر
عفریت کون کون سے ہم نے بُلا لیئے

طوفان تو ڈُبو ہی چُکا تھا ہمیں مگر
موجوں کے راز ہم نے سمُندر میں پا لِیئے

ہم نے رگوں میں زہر اُترنے ہی کیوں دِیا
دُنیا جہاں کے سانپ گلے کیوں لگا لِیئے

اِک پیٹھ موڑنا تھا ہمارا کہ اُس کے بعد
سب دوستوں نے ہاتھوں میں پتھر اُٹھا لیئے

چُن چُن کے دوستوں نے دِیئے زخم جو ہمیں
گہنے سمجھ کے ہم نے بدن پر سجا لِیئے

یوں کب تلک دورا ہے پہ رُکیئے گا اے جناب
چُپ چاپ ایک سِکہ ہوا میں اُچھالیئے

بیتابؔ شہر میں کوئی رونق نہیں رہی
یاروں نے جب سے دشت میں خیمے لگا لِیئے

سورج ہے نیا چاند نیا تارے نئے ہیں
یہ کیا پسِ دُنیا ہے جو ہم دیکھ رہے ہیں

موسم تو کئی آئے مگر خواب ہمارے
سوُکھے ہوئے پتوں کی طرح گِرتے رہے ہیں

ہر لمحہ کوئی اینٹ اُکھڑ جاتی ہے جس کی
ہم لوگ اُسی دیوار کے سائے میں کھڑے ہیں

خود اپنے ہی سائے نے ہمیں نیچا دِکھایا
ہم سوچتے تھے ہم سبھی سایوں سے بڑے ہیں

وہ ایک بھنور سُنتے ہیں دِلکش ہے غضب کا
ہیں کتِنے سفینے جو وہاں ڈوب چکے ہیں

رنگین دوکانوں میں سجے ہیں جو کھِلونے
اندر سے اگر دیکھو تو سب ٹوٹے ہوئے ہیں

بیتابؔ نمایاں نہیں کچھ ایسے مگر ہاں
ان لمبی قطاروں میں کہیں ہم بھی کھڑے ہیں

پہلے وہ اُونچا اُڑاتا ہے مُجھے
پھِر بلندی سے گِراتا ہے مجھے

کشتیاں ساری ڈُبو دیتا ہے
اپنی موجوں میں بہاتا ہے مجھے

وہ چلا آتا ہے میرے اندر
اپنی مانند سجاتا ہے مجھے

دِن میں رکھتا ہے مجھے خوابیدہ
اور راتوں میں جگاتا ہے مجھے

دھوپ میں سرد مجھے رکھتا ہے
برف رُت میں وہ تپاتا ہے مُجھے

وہ حقیقت کو سمجھتا ہی نہیں
خواب پر خواب دِکھاتا ہے مجھے

ہاتھ میں رکھتا ہے وہ میری کِتاب
سبق اپنا ہی پڑھاتا ہے مجھے

میری مِٹّی سے اُٹھا کر بیتابؔ
اپنے گملوں میں اُگاتا ہے مجھے

دِل میں آباد کُچھ مقام تو ہیں
اِتنی فرصت مگر کہاں کہ رُکیں

ڈرتے ڈرتے قدم اُٹھاتے ہوئے
چھوڑ دہیں پیچھے ہم نے ساری حدیں

وہی بے موسمی سی ہے اندر
اور باہر وہی رُتوں پہ رُتیں

اِن خلاؤں میں ہے زمین کہاں
اب جو اُتریں تو پاؤں کِس پہ رکھیں

چھوڑ دیں موج موج سے لڑنا
چلو دریا کے ساتھ ساتھ بہیں

گھونسلوں کو چلے ہیں پنچھی بھی
چلو بیتابؔ ہم بھی گھر کو چلیں

آج محصور ہیں دیمک زدہ دیواروں میں
ہم بھی شامِل تھے کبھی شہر کے معماروں میں

آخرش ہاتھ جلا ہی لیئے اپنے ہم نے
جانے کیوں پھول نظر آتے تھے انگاروں میں

یہ کِسی سے نہ کہا لعل و جواہر تھے ہم
پتھروں کی طرح بِکتے رہے بازاروں میں

دیر تک دستکیں دیتی رہی قِسمت در پر
اور ہم اُلجھے رہے اپنے ہی پنداروں میں

زِندگی تیرے اداکار تھے کیسے ہم بھی
سامنے آتے رہے ہیں کئی کرداروں میں

وقت ہے کر لو مرمّت ابھی گھر کی بیتابؔ
ابھی روزن نہیں ظاہر ہوئے دیواروں میں

اب زیادہ جھُکا نہیں جاتا
یعنی عیبِ انا نہیں جاتا

بولنے میں زِیاں تو ہے بے شک
چُپ بھی لیکن رہا نہیں جاتا

زِندگی کا عجیب چسکا ہے
قبر میں بھی مرا نہیں جاتا

بھر گئیں کھائیاں سبھی باہر
اندرونی خلا نہیں جاتا

ہے یہ شیوہ کمال رونے کا
خوشی میں بھی ہنسا نہیں جاتا

چلو اِس راہ سے گزر جائیں
راستوں میں رُکا نہیں جاتا

جب حقائق ہوں چار سُو بیتابؔ
خواب کوئی بُنا نہیں جاتا

اپنی طرح سے کوئی بھی اپنا نہیں ہُوا
خود سے بہت ہوئے کوئی ہم سا نہیں ہُوا

اِک زِندگی ہماری طرح سے نہ ہو سکی
ہونے کو اِس جہان میں کیا کیا نہیں ہُوا

تھا موج موج شوق نہ پورا ہُوا مگر
کشتی نہیں ہوئی کبھی دریا نہیں ہُوا

ہم کامیاب ہو گئے ہر اِمتحان میں
لیکن بلند اپنا سِتارہ نہیں ہُوا

چلتی تو اُس سے آگے بھی ہے داستانِ طوُر
جلوے کئی ہوئے کوئی مُوسیٰ نہیں ہُوا

بیتابؔ مُجھ میں مر گیا اِک شخص ایک دِن
پھِر اُس کے بعد وہ کبھی زِندہ نہیں ہُوا

ذرا جھک جایئے جزا ہے بہت
ہاں مگر راہ میں انا ہے بہت

مَیں جہاں ہوں وہاں سے مَیں بھی ہوں ٹھیک
تو بھی اپنی جگہ بجا ہے بہت

میں جو ظاہر میں ہوں بہت بھرپور
میرے اندر کوئی خلا ہے بہت

برف بے شک پگھل چُکی کب کی
یخ مگر آج بھی ہوا ہے بہت

میرا ہمزاد ہم نفس وہ مِرا
مُجھ سے ہر بات میں جُدا ہے بہت

آفتیں بے شمار ہیں بیتابؔ
اپنا بھی اک مگر خُدا ہے بہت

جن کی گونج آ رہی ہے باہر سے
وہ سوال اُٹھ رہے ہیں اندر سے

اِک ہماری زمیں رہی پیاسی
ورنہ بادل کہاں نہیں برسے

ہم بھی اُس ہجرتوں کے موسم میں
نِکل آئے جنون میں گھر سے

بچھوؤں کی ہمیں خبر ہی نہ تھی
ہم تو خائف تھے ایک اژدر سے

دست و پا ہم نے خود ہِلائے نہیں
گِلا کِس بات کا سمندر سے

ایک آسیب کو اُتارا تھا
سبھی آسیب اُتر گئے سر سے

جنگل اِک لانگھنا پڑا بیتابؔ
ہمیں نسبت تھی اِک صنوبر سے

آج کُچھ زِندگی میں کر جائیں
عین ممکن ہے کل گزر جائیں

نئے آفاق اُدھر اِدھر تہذیب
اِک تذبذب ہے اب کِدھر جائیں

اب یہ کشتی ہے اور یہ طوفان
ڈُوب جائیں کہ پار اُتر جائیں

برف صورت ہیں منجمد جو ہم
پانیوں کی طرح بِکھر جائیں

الگ اطوار ہوں الگ انداز
زیست اپنی طرح سے کر جائیں

موج میں زِندگی گُزر جائے
اور جب موج آئے مر جائیں

راستوں میں ہیں راستے بیتابؔ
سمجھ آتی نہیں کِدھر جائیں

کشتی بھی شِکستہ ہے یہ طوفان بھی پیہم ہے
ساحِل کے نظر آنے کی اُمّید بھی کم کم ہے

ہم وقت کے پردے پہ نمایاں تو ہوئے لیکن
تصویر بھی دُھندلی ہے اور آواز بھی مدھم ہے

باہر وہی پُروائی وہی سبز مناظر ہیں
اندر وہی صحرا وہی تپتا ہُوا موسم ہے

ہر لمحہ بدلتی ہوئی تصویر ہے یہ دُنیا
آج اور ہی کچھ رنگ تو کل اور ہی عالم ہے

ہے خون بھی گردِش میں دھڑکنا بھی ترا جاری
پھِر کون سا رونا ہے مِرے دِل تُجھے کیا غم ہے

خوشحال مُجھے دیکھنے والے تو یہ کیا جانے
پُر سوز مِرا دِل ہے مِری آنکھ بھی پُرنم ہے

محنت کا صِلہ شہرِ ستم گر میں خُدا جانے
خواہش تو بہت ہے مگر اُمّید بہت کم ہے

گِرتے ہو پھر اُٹھ جاتے ہو چل دیتے ہو پھر آگے
بیتابؔ یہ جینے کی للک فِطرتِ آدم ہے

ہر قدم ایک اِمتحان کے ساتھ
زِندگی ہم نے کی ہے شان کے ساتھ

کیا بتائیں زمین والوں کو
تجربے اپنے آسمان کے ساتھ

وہ نظر کی حدوں سے آگے ہے
ہم جِسے دیکھتے ہیں دھیان کے ساتھ

سائے رہتے ہیں اِن مکانوں میں
لوگ رہتے ہیں لامکان کے ساتھ

ہم زمیں پر قیام کرتے ہیں
اور رہتے ہیں آسمان کے ساتھ

زِندگی سے طویل ہیں بیتابؔ
مسئلے اپنے اِس جہان کے ساتھ

زمانہ تھا ہماری دسترس میں
مگر جب ہم نہ تھے خود اپنے بس میں

نہ بھیگے عُمر بھر باہر کے موسم
نہ بھیگے ہم کبھی اندر کے رس میں

ہے سب کارِ جہاں گویا اُسی سے
ہے غلطاں کُل زمانہ اِک ہَوس میں

رہا جو بے ثمر اِس بار موسم
رہی اُمیّد اب اگلے برس میں

اماوس کو بنا دیتا ہے پونم
ہے اِک جگنو ہماری دسترس میں

فقط الفاظ کی جادُوگری ہے
تعلق چند وعدے چند قسمیں

کہاں پروازِ ہفت افلاک بیتابؔ
کہاں اِک طائرِ بے پر قفس میں

یوں تو مری ہر تان زمانے کے لِئے ہے
اِک راگ مگر دِل میں چھپانے کے لِئے ہے

دُنیا سے الگ ہے ابھی اِک ٹکڑا زمیں کا
بستی ابھی اِک اور بسانے کے لِئے ہے

باقی ہے ابھی شہر کی تہذیب ذرا سی
دیوار ابھی اِک اور اُٹھانے کے لِئے ہے

جو دِل سے نِکلتا ہے وہ جذبہ نہیں باقی
اب ہاتھ فقط ہاتھ مِلانے کے لِئے ہے

تن رنگ دے من رنگ دے ایسا نہیں کوئی
ہر رنگ فضاؤں میں اُڑانے کے لِئے ہے

اندر وہی چُبھتا ہے کِسی خار کی صورت
رِشتہ جو بہر حال نبھانے کے لِئے ہے

بیتابؔ وہی ڈُوبا ہُوا ہے کئی دِن سے
اِک تارہ جو تقدیر بنانے کے لِئے ہے

اُس کا کمال ہے کہ خزاں پُر بہار ہے
حدِ نظر تلک جو طِلسمی حِصار ہے

شمس و قمر تمام ہیں چکّر میں چار سُو
دُنیا ئے بے قرار میں کِس کو قرار ہے

آگے بھی دُور تک نہیں روشن کوئی سُراغ
پیچھے بھی دُور دُور یہی اندھا غار ہے

اِن آبلوں کو پاؤں سے نِسبت ہے دائمی
آگے یہی سفر ہے یہی خارزار ہے

پنجر بسے ہُوئے ہیں خرابوں میں چار سُو
گنجان شہر کیا ہے اِک اُجڑا دیار ہے

جھونکے کہیں سے آتے ہیں تازہ ہواؤں کے
کُنجِ قفس کہیں کوئی راہِ فرار ہے

بیتابؔ تُم فقیر کہاں آگئے مِیاں
اِس شہر میں اِک ایک بشر شہریار ہے

ظاہر میں بھی کیا کیا پردہ داری ہے
دُنیاداری پُرکاری عیّاری ہے

دونوں جانب سے بچنا فن کاری ہے
دُنیا کی تلوار مِیاں دو دھاری ہے

ایک مُسلسل دوڑ میں شامِل ہم بھی ہیں
شوق نہیں یہ اِک ذہنی بیماری ہے

پاؤں تلے خوش وادی اور سفر آگے
رُک نہیں سکتے ہم کیسی لاچاری ہے

بادِ مخالف پورا زور لگا تُو بھی
اِس جانب سے بھی پوری تیّاری ہے

ماضی میں تُم جیت گئے ہم سے بیتابؔ
مستقبِل کی جنگ ابھی تک جاری ہے

اِس کا پانا ہی جیسے کھونا ہے
زِندگی بھی عجب کھِلونا ہے

فِکرمندی ہو چاہے بے فِکری
ہو کے رہتا ہے وہ جو ہونا ہے

رنج تشویش درد وہم و گماں
بوجھ کیا کیا ہے جِس کو ڈھونا ہے

رات دِن سے پرے ہے کیف آباد
جاگنا ہے جہاں نہ سونا ہے

رنگ اپنا کہاں کِسی کا رہا
زرد چاندی سفید سونا ہے

ق
اُس کی یادیں ہیں خواب اُس کے ہیں
اُس کا جادُو ہے اُس کا ٹونا ہے
چار جانب اُسی کا ہے جلوہ
شام جو سانولا سلونا ہے

اپنے زخموں کو اے دِلِ بیتابؔ
اپنے ہی آنسوؤں سے دھونا ہے

سر جزیروں کے پھر سے اُبھرنے لگے
وہ جو پانی چڑھے تھے اُترنے لگے

موج در موج دریا تھا پیشِ نظر
شور اندر کے پانی بھی کرنے لگے

ہم نے صحرا میں چھوڑے تھے جو نقشِ پا
سب کے سب آندھیوں میں بِکھرنے لگے

ہم نے ماضی میں ٹھکرائی ہیں منزلیں
راستوں میں کہاں ہم ٹھہرنے لگے

اب کِسی دوست سے کوئی شِکوہ نہیں
وقت کے ساتھ سب زخم بھرنے لگے

پا شِکستہ ہوئے جب سے بیتابؔ ہم
راستے سامنے سے گزرنے لگے

نئے موسم نئے زمانے میں
ہم کہاں اب کِسی فسانے میں

بُت پرستی کے ہیں نئے انداز
نئے بُت ہیں نئے زمانے میں

بجتے رہتے ہیں شادیانے سے
یاد کے ایک شامیانے میں

پا بہ زنجیر ہم رہے مزدُور
زِندگی تیرے کارخانے میں

اُس کی تصویر ہے بہ ہر تصویر
جو نہیں ہے نِگار خانے میں

نام خود سے جُدا رکھا بیتابؔ
رہے گمنام ہم زمانے میں

گِرتے ہیں گِر کے ہم سنبھلتے ہیں
زلزلے ساتھ ساتھ چلتے ہیں

کیا عجب طرزِ نو ہے رِشتے بھی
موسموں کی طرح بدلتے ہیں

بحر در بحر ہے کوئی وحشت
پانی کِس کِس طرح اُچھلتے ہیں

ہر طرف ہیں ڈھلان کیا کرِیئے
پاؤں تو لازماً پھِسلتے ہیں

عُمر خود سے گُزرتی جاتی ہے
دِن بمُشکل مگر نِکلتے ہیں

اِن خرابوں کی زِندگی بیتابؔ
دِل چراغوں کے ساتھ جلتے ہیں

آئینے میں گھورنے والا ہے کون
اور اُس کے سامنے والا ہے کون

ہر قدم کرتا ہے جو میری نفی
میرے اندر بولنے والا ہے کون

مَیں اگر ہوں آسماں در آسماں
یہ زمیں پر رینگنے والا ہے کون

کِس کے پیچھے دوڑتا رہتا ہوں مَیں
آگے آگے بھاگنے والا ہے کون

میں ہوں آتش دان سے چپکا ہُوا
برف و باراں ناچنے والا ہے کون

عَین میرے دھیان پر کرتا ہے وار
مُجھ کو مُجھ سے چھیننے والا ہے کون

کون ہے بیتابؔ آخر گمشُدہ
اور اُس کو ڈھونڈنے والا ہے کون

کُچھ لوگ زمانے کی ہوا دیکھ رہے ہیں
ہم دیکھنے والوں کی ادا دیکھ رہے ہیں

یہ چاند یہ تارے یہ خلا دیکھ رہے ہیں
سو رنگ میں ہم ایک انا دیکھ رہے ہیں

ہم بھی ہیں وہی لوگ وہی شہر وہی ہے
بس آج یہ کچھ اور ہوا دیکھ رہے ہیں

دُنیا تو ہے بھرپور مگر ہم ہیں کہ ہر سمت
خود اپنے ہی اندر کا خلا دیکھ رہے ہیں

ہم سات سمندر سے گزر آئے سلامت
اب سامنے اِک بحرِ انا دیکھ رہے ہیں

ہے غارِ سیہ میں کہیں روشن کوئی روزن
ہم اپنے اندھیرے میں ضِیا دیکھ رہے ہیں

بیتابؔ غبارے ہیں بہت خوب مگر ہم
اندر جو بھری ہے وہ ہوا دیکھ رہے ہیں

قدم اگلا تھا پذیرائی کا
مرحلہ آ گیا پسپائی کا

جاگ اُٹھے سوئے ہوئے درد مِرے
شکریہ تیری مسیحائی کا

بند آنکھوں میں کھُلا تہہ در تہہ
راز اندر کی شناسائی کا

ایک حاصِل ہے یہ صحرا کا سفر
اِک تصوّر چمن آرائی کا

بندگی ہم کو بھی ہے باعثِ ناز
تُجھ کو دعویٰ ہے جو مولائی کا

سائے اُبھر آئے ہیں دیواروں پر
آج کیا رنگ ہے تنہائی کا

اُس سے اُمّید ہے بارِش کی ہمیں
ایک جھونکا ہے جو پُروائی کا

زِندگانی ہے مسلسل بیتابؔ
اِمتحان اپنی شکیبائی کا

ہم نے مانا کہ زِندگی کیا ہے
زِندہ رہنے میں حرج بھی کیا ہے

بال و پر قائم آسمان کھُلا
پھِر یہ احساسِ بے پری کیا ہے

مَیں نہیں ہوں یہاں تو پھِر ہوں کہاں
یا اِلٰہیٰ یہ بے خودی کیا ہے

مُجھ کو باہر دھکیلنے والی
میرے اندر یہ بے کلی کیا ہے

بات میں ہونی چاہئیے کچھ بات
ریختہ کیا ہے فارسی کیا ہے

دِل کا دریا ہو موجزن بیتابؔ
شعر کیا چیز شاعری کیا ہے

آلام کی زد میں ہے مگر شاد بہت ہے
دِل عہدِ غُلامی میں بھی آزاد بہت ہے

فُرصت ہے کِسے بیٹھ کے رونا جو کوئی روئے
رُوداد میں ہر چند کہ اُفتاد بہت ہے

سو رنگ سے آباد کِیا ہے اِسے ہم نے
یہ شہرِ تمنّا ہے کہ برباد بہت ہے

دیوانے ہو رکھتے ہو یہاں داد کی اُمّید
بے داد بہُت ہے مِیاں فریاد بہت ہے

بیتابؔ گرفتار ہیں سب عالمِ ہو میں
ہے خوف کا آسیب جو آزاد بہت ہے

موج در موج دِکھاتی ہے مجھے
آبجو ایک بُلاتی ہے مجھے

کہیں لے جا کے چھپا دیتی ہے
جب بھی وہ مُجھ سے چُراتی ہے مجھے

میں بھٹک جاتا ہوں اُس جنگل میں
اور وہ راہ دِکھاتی ہے مجھے

خواب جنگل میں ہے کوئی کوئل
نِت نئے راگ سُناتی ہے مجھے

پاؤں مَیں جھیل میں رکھتا ہوں فقط
موج خود آگے بڑھاتی ہے مجھے

پیکرِ خاک ہوں مَیں وہ ہے پری
آسمانوں میں اُڑاتی ہے مجھے

وہ جو صحرا کی ہوا ہے بیتابؔ
ریت کے ساتھ اُڑاتی ہے مجھے

کِتنا آسان زیست کرنا ہے
روز جینا ہے روز مرنا ہے

خوب سجنا ہے اور سنورنا ہے
نئے جامے میں آج اُترنا ہے

شام ڈھلنے لگی ہے چار طرف
ابھی دریا بھی پار کرنا ہے

پھِر پہننا ہے اِک سفید لِباس
کالے پانی میں پھِر اُترنا ہے

ہے کڑا اِمتحان بحرانا
ڈُوبنا ڈُوب کر اُبھرنا ہے

دِلِ ناداں ہے خوش بھی خائف بھی
نئے پانی میں پاؤں دھرنا ہے

ابھی باقی ہے ایک دَور نیا
پھِر سِمٹنا ہے پھِر بِکھرنا ہے

نئی تصویر ہے تصوّر میں
کورے کاغذ میں رنگ بھرنا ہے

دشت زادوں کے خواب میں بیتابؔ
برف چشمہ ہے جھیل جھرنا ہے

جِن سے مقصود ہیں منزل کے نِشانات مجھے
بھولتے جاتے ہیں وہ سارے اِشارات مجھے

راہِ عِرفان میں بھٹکے ہیں کُچھ ایسے دونوں
مَیں اُسے ڈھونڈتا ہوں اور مِری ذات مجھے

اُن کے ڈر سے کئی راتیں مِری بے خواب رہیں
ڈھونڈتی پھِرتی ہیں خوابوں میں جو آفات مجھے

دُوسروں کے لئے وافر ہیں مِرے پاس جواب
کِتنے مشکِل ہیں مگر اپنے سوالات مجھے

یہیں روشن ہے کِسی ایک خرابے میں چراغ
اِک ذرا راہ دِکھا دے یہ سیہ رات مجھے

چھین لیتا ہے کبھی میرے محاسن بیتابؔ
بخش دیتا ہے کبھی اپنی کرامات مجھے

مِری آنکھ پر تھا پڑا ہُوا وہ جو پردہ اُس نے ہٹا دِیا
نہ زمیں رہی نہ زماں رہا کہ جب اُس نے جلوہ دِکھا دِیا

وہ نہ ہو کے بھی مِرے ساتھ ہے گھنے جنگلوں میں رواں دواں
کئی بار جب مَیں بھٹک گیا مُجھے اُس نے رستہ دِکھا دِیا

وہ ہے بادشاہوں کا بادشہ یہ کمال اُسی کی نظر کا ہے
کہ اُٹھا دِیا تو اُٹھا دِیا جو گِرا دِیا تو گِرا دِیا

تھا اُداس اُداس کٹا کٹا مَیں خود اپنی ذات سے تھا الگ
مِرا ہاتھ ہاتھ میں تھام کر مُجھے اُس نے مُجھ سے مِلا دِیا

کہیں موت کا ہُوا سامنا تِری منزلت سمجھ آ گئی
کہ ہمیں گُمان تھا زِندگی تِرا قرض ہم نے چُکا دِیا

موجوں میں بہہ گیا تھا بڑا بے قرار بھی
دِل دم بخود کھڑا ہے مگر آر پار بھی

اِس زِندگی کی دوڑ میں ہم جیت بھی گئے
خود پر مگر نہیں تھا کبھی اعتبار بھی

دُنیائے رنگ و بو سے کِنارہ نہ کیجئے
رکھیئے مگر کہیں کوئی راہِ فرار بھی

ہم نے بہت ادا بھی کِیا نقدِ زِندگی
باقی بہت رہا مگر اِس کا اُدھار بھی

دِل سے نہ یہ مگر کبھی مانوس ہو سکا
بے شک زمانہ ہے مِرے سر پر سوار بھی

ہے آج سبزہ زار اِسی راہ میں مگر
آئے ہیں سنگ زار کئی خار زار بھی

رہتا ہے صُبح سے کہیں تیرا خیال گُم
رہتا ہے شام سے ہی تِرا اِنتظار بھی

بیتابؔ کُچھ عجیب تِری نفسیات ہے
نفرت بھی ہے کبھی کبھی دُنیا سے پیار بھی

روشنی میں بھی تیرگی ہے مِیاں
کیسی کالی ہوا چلی ہے مِیاں

زِندگی تو ہے بچ نِکلنے کا نام
موت ہر موڑ پر کھڑی ہے مِیاں

مست بیٹھے ہو جِس کے سائے میں
وہی دیوار گِر رہی ہے مِیاں

کمی کوئی نہیں مگر پھِر بھی
جانے کِس چیز کی کمی ہے مِیاں

نہیں آتا کہیں سے کوئی جواب
اپنی آواز گونجتی ہے مِیاں

شش جہت ہے وہی حِصارِ خودی
ساتویں سمت بے خودی ہے مِیاں

کھود ڈالو غموں کا اُونچا پہاڑ
اِس کے اندر بڑی خوشی ہے مِیاں

اُونچی اُونچی صداؤں میں بیتابؔ
تیری آواز دب گئی ہے مِیاں

مِرے ریگزار وجود کو تونے سبز باغ بنا دِیا
حدِ ممکنات سے ہے پرے یہ جو خواب مُجھ کو دِکھا دِیا

مَیں بھٹک رہا ہوں خلا خلا رکھوں پاؤں اب تو کہاں رکھوں
تونے آب و ِگل سے اُکھاڑ کر مجھے آسماں میں اُڑا دِیا

یہ مرے نصیب کے نام پر تونے مجھ پہ کیسا کِیا سِتم
کہ مَیں ہوں گُہر تجھے عِلم تھا مجھے پتھّروں میں مِلا دِیا

میں تو سوچتا تھا تری دوا مِرے عارضے کا عِلاج ہے
اَے طبیب تونے یہ کیا کِیا مِرا درد اور بڑھا دِیا

کہیں روشنی کہیں تیرگی یہ تمہارا کھیل عجیب ہے
کہیں اِک چراغ جلا دِیا کہیں اِک چراغ بجھا دِیا

کوئی مُسکرا کے نِکل گیا کوئی راستہ ہی بدل گیا
سرِ راہ جو بھی مِلا ہمیں اُسے دل کا زخم دِکھا دِیا

وہ عارضہ خود ہی نہ رہا میرے بعد
کِس کام کی تھی کوئی دوا میرے بعد

پہلے تو مچلتی تھی بہکتی تھی بہت
خاموش ہوئی بادِ صبا میرے بعد

دُشمن بھی نظر آنے لگے دوست مُجھے
شِکوہ نہ کوئی رنج رہا میرے بعد

روداد مِری جو نہیں سُنتے اُن کو
یاد آئے گا افسانہ مِرا میرے بعد

سب کہتے ہیں ناگُفتنی ہے مت پوچھو
اُس بزم کا جو حال ہُوا میرے بعد

حاسِد مِرا دیوانہ ہُوا ہے بیتابؔ
کرتا ہے مِری صِفت وثنا میرے بعد

حدِ نظر ہے یا کوئی دیوار دیکھنا
پھر ہو سکے تو پار کے آثار دیکھنا

وہ چشمِ نیم وا میں اُترتا ہے غیب سے
اُس خوب رُو کے خواب کو بیدار دیکھنا

بھرپور اعتبار سے تیشہ اُٹھائیو
رستہ ضرُور دیگا یہ کُہسار دیکھنا

تو نے تو اپنا زور دِکھا ہی دِیا مُجھے
بادِ مخالف اب مِری رفتار دیکھنا

گُفتار پر نہ جائیو شیریں زباں ہے وہ
پُرکار دیکھنا اُسے عیّار دیکھنا

بے شک دیارِ غیر میں اپنا کوئی نہیں
کوئی نِکل ہی آئے گا غمخوار دیکھنا

بیتابؔ دم بخود یہ ترا پَل کے درمیان
اِس پار دیکھنا کبھی اُس پار دیکھنا

سفر کالی زمینوں کا ہُوا طے
اور اب کالا سمندر سامنے ہے

وہ جس کے سائے میں ہم بیٹھتے تھے
گئی وہ ریت کی دیوار بھی ڈھے

مَیں اکثر خواب میں جو دیکھتا ہوں
حقیقت میں وہی سب لا پتہ ہے

مِرے اندر جو اِک دُنیا ہے موجود
یہ دُنیا سامنے اُس کے ہے کیا شے

کوئی سایہ ہے یا شُعلہ ہے کوئی
تعاقب میں مِرے رہتی ہے اِک شے

وہاں تو غلغلہ ہے تشنگی کا
کہاں مِلتی ہے مَے خانے میں اب مَے

یہی آہنگ ہے بیتابؔ اپنا
جُدا سب سے ہے سُر سب سے الگ لَے

لایعنی بقا اور فنا میرے بعد
تھا مُجھ سے وہ سب کُچھ نہ رہا میرے بعد

میں ساری حدیں چھوڑ چُکا تھا پیچھے
یہ راز مگر مُجھ پہ کھُلا میرے بعد

اِک عُمر مِرے اور مِرے بیچ رہا
پُر ہو گیا خود سے جو خلا میرے بعد

دستار کِسی سر پہ سلامت نہ رہی
باقی نہ رہا رنگِ انا میرے بعد

بیتابؔ وہ توفیق نہیں تھی پہلے
راس آئی مُجھے اُس کی رضا میرے بعد

کالا جادُو پھَیل رہا ہے
اور خُدا خاموش کھڑا ہے

کالے سائے ناچ رہے ہیں
چار طرف پُر شور ہوا ہے

آگ دِکھا کر جلنے والو
کِس کی آگ میں کون جلا ہے

سانس بھی تُم لیتے ہو کیونکر
اُف کِتنی مسموم ہوا ہے

لاکھوں بھیڑیں دوڑ رہی ہیں
ایک گڈریا ہانک رہا ہے

رقص کُناں ہوں اِک رسّی پر
اور توازن بگڑ رہا ہے

مَیں رستے کو ڈھونڈ رہا ہوں
رستہ مُجھ کو ڈھونڈ رہا ہے

کون ہے یہ بیتابؔ جو کب سے
رستے میں چُپ چاپ کھڑا ہے

نہیں معلوم کِدھر جاؤں گا
ہاں مگر پُل سے گُزر جاؤں گا

کون کہتا ہے کہ مر جاؤں گا
ڈُوب کر پھر سے اُبھر جاؤں گا

ہمسفر ہے مِری آشفتہ سری
ساتھ جائے گی جِدھر جاؤں گا

شاخ سے ٹوٹا ہُوا پتّہ ہوں
کِسے معلوم کِدھر جاؤں گا

دُور اُڑتا ہُوا صحراؤں میں
ریت کے ساتھ بِکھر جاؤں گا

پا شِکستہ ہوں بس اب تو گویا
کوئی منزل ہو ٹھہر جاؤں گا

رات پھِر دِن کو نِگل جائے گی
پھِر سے بِستر میں اُتر جاؤں گا

خُود سے کٹ کر ہوں ابھی تک زِندہ
تُجھ سے بِچھڑوں گا تو مر جاؤں گا

عَین ممکن ہے کِسی دِن بیتابؔ
کِسی دریا میں اُتر جاؤں گا

نہ اترا عُمر بھر پارہ ہمارا
رہا سَیلاب میں دریا ہمارا

قصور اب سوچتے ہیں در حقیقت
تھا آدھا آپ کا آدھا ہمارا

اندھیرے بے طرح تھے حملہ آور
نہیں تھا ساتھ جب سایہ ہمارا

تغیّر آندھیاں سَیلاب کیا کیا
نہیں اُکھڑا مگر خیمہ ہمارا

کہانی اِک نئی پیدا ہوُئی تھی
ہوُا تھا ختم جب قِصّہ ہمارا

پہنچ جانا ہمارا معجزہ ہَے
کٹھِن تھا کِسقدر رستہ ہمارا

عجب سی بے رُخی رہتی تھی خود سے
تھا جب چاروں طرف شُہرہ ہمارا

تھے حِصّے دار رِشتے دار بیتابؔ
وہی سب کھا گئے حِصّہ ہمارا

رواں ہے چار سوُ رستہ ہمارا
سفر میں دِل نہیں گویا ہمارا

وہی اِک جستجو کوہ و دمن کی
وہی کاغذ پر اِک نقشہ ہمارا

ہیں بے شک سلطنت کے بادشہ ہم
مگر چلتا نہیں سِکّہ ہمارا

نہ ہم سُدھرے نہ حالت ہی ہماری
وہی ہم ہیں وہی طبقہ ہمارا

بھٹکنا کوُچہ و بازار بے سود
عجب سر میں ہے اِک سَودا ہمارا

کنارے ہیں نظر کی حد سے آگے
نہ تَیرا جائے ہے دریا ہمارا

ہے یہ تصویر تو بے شک ہماری
ہے کُچھ بدلا ہوُا چہرہ ہمارا

وہی جو ناچتا رہتا ہے بیتابؔ
وہی کالا تو ہے سایہ ہمارا

دور تک کوئی شجر تھا ہی نہیں
تھا بھی کوئی تو ثمر تھا ہی نہیں

یاد اِتنا ہے کہ اِک موڑ آیا
اور پھر راہ گزر تھا ہی نہیں

گُمرہی تھی کہ بڑھی جاتی تھی
تھا بیابان خضؔر تھا ہی نہیں

کیسی منزل تھی کہ منزِل ہی نہ تھی
کیا سفر تھا کہ سفر تھا ہی نہیں

ہم نے دہلیز سے باہر آ کر
مُڑ کے دیکھا تو وہ گھر تھا ہی نہیں

رات روشن تھے خرابے کیا کیا
صبح وہ دشت نگر تھا ہی نہیں

وہی تھا میری نظر میں بیتابؔ
وہ جو تا حدّ نظر تھا ہی نہیں

ہر گھڑی اِک بلا میں رہتا ہے
آسماں بھی انا میں رہتا ہے

کہہ گیا خیرباد جو درویش
شہر اُسی کی صدا میں رہتا ہے

قدم اُٹھتا ہے دِن کے خوابوں میں
پاؤں شب کی رِدا میں رہتا ہے

وہ جو رہتا ہے زرد پتّوں میں
وہی بادِ صبا میں رہتا ہے

رہتی ہے کچھ ہوا غُبارے میں
کچھ غُبارہ ہوا میں رہتا ہے

دِل بھٹکتا ہے کُوچہ و بازار
ہاتھ بے‌شک دُعا میں رہتا ہے

حال اچھّا تو ہو بھی جائے مگر
درد اپنی دوا میں رہتا ہے

انتہا پر پہنچ کے بھی دراصل
آدمی اِبتدا میں رہتا ہے

وہ جو بیتابؔ ہے مِرے اندر
عالمِ ماورا میں رہتا ہے

کئی جھرنوں کی ہے دُعا پانی
اِک سمُندر کی ہے انا پانی

دِل کے دریا کی موج کیا کہیے
چڑھ گیا پھِر اُتر گیا پانی

آج موسم کی پہلی بارِش تھی
دیر تک ناچتا رہا پانی

اِک ندی جا ملِی سمُندر سے
اور پانی سے مِل گیا پانی

اشک تھمنے میں ہی نہ آتے تھے
پھٹ پڑا تھا رُکا ہُوا پانی

ورنہ سیلاب تھا قیامت کا
رفتہ رفتہ اُتر گیا پانی

خُشک بنجر قدیم دھرتی پر
آج اچانک برس پڑا پانی

برف تھی اور دھوپ تھی بیتابؔ
بہہ گیا سب جما ہُوا پانی

کِسی دیوار میں در تھا ہی نہیں
بند گُنبد تھا وہ گھر تھا ہی نہیں

وہی آسیب تھا ڈر جِس کا بہُت
سامنے آیا تو ڈر تھا ہی نہیں

سیپیاں جلوہ نما تھیں کیا کیا
بحر در بحر گُہر تھا ہی نہیں

رات ہی پھیلی ہوئی تھی ہر سُو
آج وہ رنگِ سحر تھا ہی نہیں

میرے شانوں پہ تو اُونچا تھا بہُت
آئینے میں مِرا سر تھا ہی نہیں

اُن دُعاؤں میں انا تھی بیتابؔ
اُن دُعاؤں میں اثر تھا ہی نہیں

لذتوں سے گُناہ تھے محرُوم
جُرم کر کے بھی ہم رہے معصوم

کُچھ وہ تارہ بھی کھُل گیا ہم سے
اور کُچھ تھا ہمیں بھی عِلمِ نجوم

ہے نوشتہ اِک ابرِ رحمت کا
دِل کے صحرا پہ جا بجا مرقوم

اُسے معلوم ہیں پتے سب کے
اور اُس کا پتہ ہے نا معلوم

تیرے جلوے کمال ہیں مولیٰ
کل جو حاکم تھے آج ہیں محکوم

ایسا کیا ہے جو مچ گئی بیتابؔ
تیرے ہونے کی اک جہان میں دھوم

اُونچے پربت برس پڑا پانی
پھر ڈھلانوں سے ڈھل گیا پانی

دُور دیکھا تھا ابر کا ٹکڑا
میں نے صحرا پہ لِکھ دِیا پانی

کنواں سوُکھا پڑا تھا مُدّت سے
آج یک لخت اُبل پڑا پانی

کہیں جانے کا راستہ ہی نہ تھا
رہا تالاب میں کھڑا پانی

بوڑھے دریا سے تھا گُزر اپنا
تھا کبھی تو کبھی نہ تھا پانی

باندھ میں آ گیا تھا ایک شِگاف
کھیت کھلیان بھر گیا پانی

مُڑ کے واپس نہ آئے گا بیتابؔ
پُل کے نیچے جو بہہ گیا پانی

نظمیات

آج سوچا تو یہ ہُوا معلوم
ہم خود اپنی بقا میں ہیں معدوم

نعمتیں رحمتیں تھیں رب کی تمام
خود سے ہم رہ گئے مگر محروم

زِندگی اور بے یقینی ہیں
آج آپس میں لازِم و ملزوم

کالے پیلے تمام ایک پہ ایک
وقت نے آزمائے ہم پہ علوم

کوئی اِس شہر میں کِسی کا نہیں
نبھ رہی ہیں رفاقتوں کی رسوم

کئی اشعار آپ کے بیتابؔ
دور کے پانیوں پہ ہیں مرقوم

نُقطۂ نو گُریز

یہاں تک پڑھی ہوئی ساری کتابیں
دیکھی ہوئی تمام دُنیا بلکہ دُنیائیں
اندر باہر کے تمام تجربات
ماضی کا حِصّہ ہیں
تاریخ بن چکے ہیں
یہاں سے آگے سفر نیا ہے بالکل نیا
کاغذ کورا ہے بالکل کورا
بلکہ تمام کاغذ کورے ہیں بالکل کورے
تحریر منتظر ہے
نقطۂ آغاز ہے بلکہ موہُوم ہے
ہندسۂ یکم ہے بلکہ صِفر ہے
حرف اَلِف ہے
بلکہ اِک نیا اَلِف ہے

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے
(غالبؔ)

نہیں یہ بھی نہیں
نیچے دُوسری عالمی جنگ اور تقسیمِ ہند کا المیہ ہے
جو میرے سونے اور جاگنے کے درمیان کی کیفیت کو
اذیّت ناک بنا رہا ہے
اور اوپر ایک خواب کی چادر ہے
جس میں چاند پر میرا سو ایکڑ کا
شاید ہزار ایکڑ کا یا شاید اُس سے بھی بڑا
فارم ہاؤس ہے جس میں کھیتی باڑی سے لیکر روٹی پکانے
اور کپڑے دھونے تک کا کام مجھے خود ہی کرنا پڑتا ہے
کیونکہ نوکر چاکر تو کیا دُور دُور تک کوئی دوست کوئی غمخوار
یہاں تک کہ کوئی دُشمن بھی ڈھونڈے نہیں مِلتا
شاید وہ سب بھی اپنے اپنے
سو سو ایکڑ کے یا ہزار ہزار ایکڑ کے
یا اُس سے بھی بڑے بڑے فارم ہاؤسوں میں
مصروفِ کار ہیں میری طرح تنِ تنہا
مَیں سوچ رہا ہوں یا خواب دیکھ رہا ہوں
یا شاید پاگل ہو رہا ہوں یا پھِر شاید
دو صدیوں کے بیچ سینڈوِچ ہو رہا ہوں۔

سینڈوِچ

نیچے موٹا گدّا ہے
اوپر ایک پتلی سی چادر
جو لمحہ لمحہ موٹی ہوتی جا رہی ہے
نہیں نہیں نیچے اینٹ پتّھر کا کھُردرا بچھونا ہے
اوپر ریشم کی ایک مشینی چادر ہے
جو لمحہ ہتھ کھڈّی پر تیار کی گئی
کھُردری موٹی چادر میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔

برف موسم میں

برف موسم میں
اپنے اندر جکڑا ہُوا سُکڑا ہُوا
مَیں سوچ رہا تھا کہ سب لوگ میری طرح
صِفر سے نیچے درجۂ حرارت میں
منجمِد ہونگے اپنی اپنی پناہ گاہوں میں
کوئی باہر نکلنے کی جُرأت نہیں کر رہا ہوگا۔
لیکن لگاتار جکڑن اور سُکڑن سے
تنگ آ کر مَیں باہر نِکلا
تو دیکھا کہ ایک دُنیا باہر گھوم رہی ہے
برف سے کھیل رہی ہے
منفی صِفر درجۂ حرارت کا مذاق اُڑا رہی ہے
بند موسم کھُلی ہُوئی طبعیتوں کی وجہ سے
کھُلا کھُلا دِکھائی دے رہا ہے
مجھے اُس ایک ایک لمحے کا افسوس ہو رہا ہے
جو مَیں نے جکڑن اور سُکڑن میں گنوا دِیا ہے

تیشہ بدست

کب سے اِن پہاڑوں کے سینے چیر چیر کر
اِن کی رگیں کھوج کھوج کر
لعل و جواہر نِکال رہا ہوں
ڈھیروں کے ڈھیر لگا رہا ہوں
بظاہر بہت خوش ہوں
کہ لعل و جواہر کے یہ انبار مَیں نے لگائے ہیں
بباطن البتہ اُداس ہوں
کہ وہ لعل جِس کی مجھے تلاش ہے
ہنوز میری دسترس سے پرے ہے
دراصل وہ پہاڑ ہی ابھی تک
میری آنکھ سے اوجھل ہے
جِس میں وہ رگ ہے
جِس رگ میں اُس لعل کے
ہونے کی اُمیّد ہے

تپسّیا مکمّل تھی

پورے دِل سے کی ہوئی تپسّیا
عُمر بھر کی تپسّیا بے غرض بے اِنتہا تپسّیا
مگر جانے کب کیسے کہاں دِل میں
تپسّیا کا صِلہ نہ مِلنے کا شِکوہ جاگ اُٹھا
بجا ہوتے ہوئے بھی بے جا شِکوہ
جب تپسّیا ہی بے لوث تھی تو صِلہ کیسا؟
کِسی کی کوئی غلطی نہیں
غلطی میری ہے، جِس نے
تپسّیا کا صِلہ نہ مِلنے کا شِکوہ کِیا
نا اِنصافی کا شِکوہ کِیا
بندر بانٹ کا شِکوہ کِیا
اندھے سے شِکوہ کِیا
کہ وہ ریوڑیاں
مُڑ مُڑ کر اپنوں میں کیوں بانٹ رہا ہے

اُف توبہ

جانے کیوں دُنیا جہان کا گرد و غُبار
میرے سر میں آجاتا ہے کبھی کبھی
گویا تمام تر لاریاں بسیں کاریں
ٹرک ٹریکٹر آٹو رِکشا وغیرہ وغیرہ
سڑکوں پر نہیں بلکہ میرے سر میں چل رہے ہوتے ہیں۔
بلکہ یہ سانپوں کی طرح ایک دُوسرے میں اُلجھی ہُوئی
شاہراہوں کی شاہراہیں بھی میرے سر میں داخل ہو جاتی ہیں
بہت کوشِش کرتا ہوں کہ یہ کچرا
میرے دِماغ سے نِکل جائے
بیچ بیچ میں کچرا نِکال کر باہر پھینکتا بھی ہوں
لیکن پھِر کبھی کہیں کِسی موڑ پر
کِسی چوراہے پر پہنچتا ہوں
تو پھِر وہ سب جوں کا توں پاتا ہوں
وہی موٹریں وہی لاریاں
وہی کاریں وہی شاہراہوں کی شاہراہیں
سانپوں کی طرح ایک دُوسرے میں اُلجھی ہوئی
میرے دماغ میں داخل ہو جاتی ہیں

سوال و جواب

کئی بار سوالوں کا خیال آتے ہی
اُن کے جواب بھی فوراً ذہن میں آجاتے ہیں۔
لیکن ہر جواب قابلِ عمل بھی ہو یہ ضروری تو نہیں۔
لہٰذا سوال اکثر عمل میں رہتے ہیں
جواب اکثر بے عملی یا لاعملی کا شِکار رہتے ہیں۔
تھوڑے بہُت سوالوں کے
قابلِ عمل جوابات بھی عمل میں آتے آتے
بجائے خود سوالات کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔
سوال پھیلتے جا رہے ہیں جواب سمٹتے جا رہے ہیں۔
اب تو جواب قریب قریب غائب ہیں یا غیر موجود ہیں۔
اور سوال؟
سوال ہر طرف مُنہ کھولے تیّار کھڑے ہیں
ہر فِکر ہر نظریے ہر فلسفے کو
نظر آتے ہی نِگل جانے کو۔

اِک ذرا تھک کے

لمبے سفر کے بیچ میں اِک ذرا تھک کے بیٹھ گیا ہوں
مَیں سویا نہیں ہوں جاگ رہا ہوں
ہاں تھوڑا اُونگھ رہا ہوں
ہمسفر آگے نِکلتے ہوئے
میری طرف اِس انداز سے دیکھ رہے ہیں
گویا سوچ رہے ہوں کہ اِس کی تو بس ہوگئی
لیکن مَیں جانتا ہوں میری بس نہیں ہوئی
ابھی میرا سفر تمام نہیں ہُوا
تھکان دُور ہونے پر اُٹھوں گا پھر چل پڑوں گا اِسی راہ پر
جو آگے نِکل گئے اُنہیں اُن کا آگے نِکلنا مبارک
جو پیچھے آرہے ہیں وہ پیچھے آتے رہیں
مَیں آگے پیچھے کے جھنجٹ سے الگ
پھر اُٹھوں گا اپنی تھکن دُور ہونے پر چل دُوں گا
اپنے حساب سے اپنی مرضی سے اپنی سہولت کے مطابق
مَیں کچھوا ہوں نہ خرگوش
مَیں تو بس مَیں ہوں فقط مَیں

لڑکپن میں اور نو جوانی میں
مجھے اپنے والِد کی اکثر باتیں خاص طور سے نصیحتیں
بوسیدہ اَور فرسودہ معلوم ہوتی تھیں
بباطن بغاوت رہتی تھی بظاہر اِظہار مگر کم تھا
آج مَیں اپنی بیٹی سے
قریب قریب وہی سب کہتا ہوں
جو میرے والِد کبھی مجھ سے کہا کرتے تھے
میری بیٹی بغاوت کو اندر دبائے نہیں رکھتی
بلکہ باہر اُگل دیتی ہے
کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ مُجھ میں
میرے باپ کی رُوح داخِل ہو چُکی ہے
اَور میری بیٹی میں میری رُوح
لیکن پھِر یاد آتا ہے
کہ میرے والِد کی نصیحتوں میں گرمی نِسبتاً زِیادہ تھی
اور میری بیٹی کی بغاوت میں
گرم جوشی نِسبتاً زِیادہ ہے

خلا
ہر لمحہ
بڑھتا
جا رہا
ہے

تیسری آنکھ کھُلنے والی ہے

پہلے پہل گیرائی و گہرائی کم تھی بہُت کم
مگر مَیں اپنی نظموں کو
سلیقے سے بیاض میں سہیج کر رکھتا تھا
ایک ایک نظم کا اِندراج اور حِساب
با قاعدہ رہتا تھا
آج گیرائی و گہرائی زِیادہ ہے
مگر نظم اکثر کہیں بھی
کاغذ کے کِسی بھی پُرزے پر تحریر ہو جاتی ہے
کبھی کِسی اخبار کے ٹکُڑے پر کبھی کِسی ڈِبّے یا ڈِبیّہ پر
کبھی کبھار تو در و دیوار پر بھی۔
وقت قریب ہے جب جِس راہ سے گُزرُوں گا
اُس راہ پر نظم تحریر کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جاؤں گا
کوئی کیا کہے گا؟
اِس بات کا تو ہوش بھی نہ ہوگا

وہ رنگ ریز کہاں ملے گا؟

پہلی دُھلائی پر ہی
میری نئی پگڑی کا رنگ اُتر جانے پر
مَیں نے دستار فروش سے کہا
''گراہکوں کو دھوکہ کیوں دیتے ہو''
اُس نے جواباً کہا ''پھر کیا ہو گیا
کبھی کبھار اُتر جاتا ہے نئی پگڑی کا رنگ بھی
ہمیشہ تو ایسا نہیں ہوتا۔''
اُس نے مجھے وہ پگڑی
کسی رنگ ریز سے پکّے رنگ میں رنگوا بھی دی
بعد میں مجھے یاد آیا

پلک جھپک اور سفر تمام

کہیں جانے کا خیال آتے آتے
وہاں پہنچ جانا چاہتا ہوں
یہ بیچ کا راستہ یہ سفر یہ زمینوں پر رینگنا
یہ آسمانوں میں پر مارتے رہنا
مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا
بلکہ یہ سب وقت ضائع کرنے جیسا لگتا ہے
اکثر سوچتا ہوں بس یہاں سے وہاں ہو
بیچ میں کچھ نہ ہو وقت بھی نہ ہو
ایک جھٹکے سے یہاں ایک جھٹکے سے وہاں
ایک دُنیا سے دوسری دُنیا
ایک کائنات سے دوسری کائنات
ایک لامکاں سے دوسرے لامکاں تک
اور بیچ میں سب غائب
فقط ایک سوچ فقط ایک جھٹکا
پلک جھپک اور سفر تمام

مَیں اور مَیں اور مَیں

گاڑی پر اپنی افسرانہ ٹھاٹھ میں
اُس گاؤں میں داخل ہوتے ہی
مَیں نے دیکھا کہ ایک اور مَیں
سامنے سے بیل گاڑی کو ہانکتا ہُوا
میری طرف چلا آرہا تھا۔
تھوڑا اور آگے جاکے مَیں نے دیکھا
کہ ایک اور ''مَیں'' ناریل کے پیڑ پر چڑھا ہُوا
ناریل توڑ توڑ کر نیچے پھینک رہا تھا۔

کہ میری کئی ایک پُرانی پگڑیاں
رنگ اُڑ جانے کی وجہ سے بے کار پڑی ہیں
مَیں نے وہ سب دوبارہ رنگوالیں
گہرے پکّے رنگوں میں
وہ سبھی کی سبھی نئی نویلی دِکھائی دینے لگیں
بس پھر کیا تھا
مَیں نے اپنے کئی دُوسرے کپڑے بھی
جِن کے رنگ پھیکے پڑ چکے تھے
دوبارہ گہرے پکے رنگوں میں رنگوالیئے
وہ بھی نئے نئے لگنے لگے
کئی دِنوں سے سوچتا ہوں
میرا اپنا رنگ بھی تو پانی میں بھیگ بھیگ کر
اور دھوپ میں سوکھ سوکھ کر
پھیکا پڑ چُکا ہے
وہ رنگ ریز کہاں مِلے گا
جو مجھے بھی گہرے پکے رنگ میں رنگ دے
اور اپنی پگڑیوں اور اپنے کپڑوں کی طرح
مَیں بھی نیا نویلا دِکھائی دینے لگوں

آنکھ مچولی

وہ مجھے اندر ڈھونڈتی رہتی ہے
رسوئی میں کبھی ڈرائینگ روم میں
کبھی بیڈ رُوم میں کبھی باتھ رُوم میں
اور مَیں باہر ہوتا ہوں
بازار میں کبھی گرین پارک میں
سڑک پر کبھی جنگل میں
نہر کے ساتھ کبھی دریا کے ساتھ
یعنی جتنا وہ مجھے
اندر سمیٹنا چاہتی ہے
اُتنا مَیں باہر پھیلتا جارہا ہوں۔

تھوڑا اور آگے بڑھا تو دیکھا
کہ ایک بوڑھی بدصورت "مَیں"
ننگے پاؤں گنّے کے کھیت میں
گنّے کاٹ کاٹ کر ایک طرف ڈھیر لگا رہی تھی۔
اور پھر تھوڑا اور آگے جا کے دیکھا
کہ بہت سے چھوٹے چھوٹے "مَیں" بھری دوپہر میں
پسینے میں تر بتر گندے مَیلے کپڑے پہنے ہوئے
ایک کچّے کمروں والے سکول سے باہر آ رہے تھے۔
گاؤں سے باہر آتے آتے
اِتنے مَیں دیکھ کر مَیں اپنے مَیں کو بھول گیا۔
واپس اپنے اعلیٰ شان دفتر میں آ کے
مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میرا اپنا مَیں تو
اُس گاؤں میں ہی کہیں چھوٹ گیا تھا۔
اور یہ مَیں جو میرے ساتھ ہے
یہ تو کسی سرکاری افسر کا مَیں ہے

مَیں یہاں بھی ہوں مَیں وہاں بھی ہوں

دُکھوں بھری دُنیا کو چھوڑ کر ایک عُمر بھٹکتا رہا ہوں
یہاں وہاں پہاڑوں جنگلوں دریاؤں آبشاروں صحراؤں
بے چراغ شہروں قصبوں۔
چرِند و پرند انسان و جانور
سب سے الگ سب سے دُور
جانے کس شے کی تلاش تھی
یا شاید کوئی جستجو تھی ہی نہیں
ایک آوارگی تھی فقط آوارگی
ایک عُمر گنوا کر

غُبارِ رفتہ

لاؤلشکر کے ساتھ دُور دُور تک جا کر
پے در پے حملے کرتے رہے۔
جن سے ہارتے رہے اُن پر بار بار حملہ آور ہوتے رہے۔
جن سے جیت جاتے اُنہیں تہہِ تیغ کرتے رہے۔
عظیم الشان سلطنت قائم کرنے کی دُھن میں
خون کرتے رہے خون بہاتے رہے۔
خوف وہراس کی زندہ وجاوید مثال ہم
تمام تر قدروں قیمتوں کو پاؤں تلے روندتے رہے۔
آج وہ گھوڑے ہیں نہ ہاتھی ہیں
نہ مالِ غنیمت کے لالچی بہادروں کے لشکر ہیں۔
کچھ باقی ہے تو چند خستہ حال قلعے
بھوت بنگلے کہلانے والے چند ایک محلات
جن کی ایک ایک اینٹ لمحہ لمحہ اُکھڑ رہی ہے۔
بے بام ودر کمروں جیسی چند ایک دیواریں ہیں
جن کو دیکھ کے لگتا ہے کہ کبھی یہ عمارات کے حصّے رہی ہونگی۔
ہم نہیں ہیں مگر شاید ہم بھی ہیں پیچھے دُور
اُڑتے ہوئے غُبار میں پھیلی ہوئی
اِک فقط شرمندگی کی صورت۔

اِنتظارِ نادیدہ

دِلکش ترین مناظِر دیکھ چُکا ہوں
ایک سے ایک خوبصورت عورتوں سے
مِل چُکا ہوں
ہر قسم کے پھلوں کا ذائقہ چکھ چُکا ہوں
پھر بھی مُنتظِر ہوں
کِسی اندیکھے منظر کا
حُسن و جمال کے کِسی ایسے نمونے کا
جو مُجھے چکا چوندھ کر دے
کِسی ایسے ثمر کا
ابھی تک میری زبان جِس کے ذائقے سے
ناواقِف ہو
زِندگی شاید اِسی اِنتظار کا نام ہے
اور یہ اِنتظار شاید
زِندگی کے ساتھ ہی ختم ہو گا

سب سے اُونچے اِس پہاڑ کی سب سے اُونچی چوٹی پر
سمادھی لگائے ہُوئے آج اِس وقت آخرِ شب
آنے والی انجان سحر کی اُمّید میں
اپنے پیچھے چھوڑی ہوئی
ایک ایک شے پر نظر دوڑا رہا ہوں
تمام دُنیا ہر انسان ہر جانور ہر پرندہ
چین کی نیند سو رہا ہے
یہاں تک کہ مَیں جو یہاں
سب سے اُونچے پہاڑ کی سب سے اُونچی چوٹی پر
دھیان میں
آخرِ شب جاگ رہا ہوں
وہ مَیں بھی وہاں اپنے محل میں
اپنے بیوی بچوں کے ساتھ
چین کی نیند سو رہا ہوں
بے فِکر بے سُدھ
بے ترتیب پھیلا ہُوا۔

پانی کو غُصّہ کیوں آتا ہے

دُور دُور پھیلے ہوئے جزیروں کو
ایک دُوسرے کے ساتھ جوڑنے کے لئے
ہم نے مِٹّی ڈال ڈال کر
پانی کو اپنی جگہ چھوڑنے پر مجبور کر کے
اپنے لئے زمین تیار کر لی
پانی جو اپنی جگہ چھوڑ کر
دُوسری جگہوں میں سمانے کی کوشِش میں ہے
کبھی کبھار وہاں سے واپس دھکیلے جانے پر
اپنی پہلے والی جگہ کی طرف واپس ٹھاٹھ مارتا ہے
کبھی موج وتلاطم کبھی سونامی
کبھی دیر دیر تک نہ ختم ہونے والی
بارِش کی صورت میں
دیکھا جائے تو پانی کا غُصّہ بھی جائز ہے

بیش قیمت

لمحاتِ کوہکنی میں یہ بڑا سا ہیرا ہاتھ لگ گیا
ناتراشیدہ ہونے کی وجہ سے کوئی اِسے پہچانتا ہی نہیں
بڑے سے بڑے جوہری بھی
اِسے یونہی سی چیز جان کر آگے بڑھ جاتے ہیں
کبھی سوچتا ہوں اِسے تراش کر
اِس کی شکل صورت کُچھ اَیسی بنا دوُں
کہ عقل کے اندھے ہی نہیں بلکہ آنکھ کے اندھے بھی
اِسے دیکھتے ہی پہچان جائیں
لیکن پھِر یہ سوچ کر رہ جاتا ہوں
کہ جو اندھے ہیں
وہ اگر اِسے پہچان بھی لیں تو بھی کیا
رہیں گے تو اندھے کے اندھے ہی
اُلٹا ہیرا ہی اپنی قیمت ڈلوا کر
انمول سے بِکاوٗ ہو جائے گا۔

ہم کیوں دوڑ رہے ہیں

عجیب دوڑ ہے
ہر کوئی دوڑ رہا ہے
کوئی کار پر کوئی بس پر کوئی ٹرک پر کوئی ٹیکسی پر
کوئی آٹو رِکشا پر کوئی اِکّے تانگے پر کوئی سائکل رِکشا پر
ایک ٹانگ کی بیساکھی پر چلنے والا
اَور دو ٹانگ کی بیساکھی پر چلنے والا بھی
لکڑی کی چپٹی پر چھوٹے چھوٹے پہیئے لگا کر
رینگتے ہوئے چلنے والا بھی دوڑ میں شامِل
زمین تو زمین آسمان میں ہوائی جہاز پر

ہزاروں خواہشیں ایسی

خراب سے خراب راستوں پر
فرّاٹے سے دوڑ سکنے والی
بڑھیا موٹر کے اسٹئیرِ نگ پر میرا ہاتھ ہو۔
ٹینکی پیٹرول سے لبالب ہو
کچی پکی اندیکھی انجانی سڑکوں پر
جب چاہوں جِدھر چاہوں نِکل جاؤں آگے ہی آگے۔
جہاں چاہوں تیز رفتار سے چلوُں
جہاں چاہوں خراماں خراماں
کِسی من بھاونی سُہاونی لُبھاونی بستی یا وادی میں
کِسی خوبصورت آبشار کِسی شفاف ندی
کِسی اچھی صورت کِسی اچھی سیرت کے قریب
جب چاہوں رُک جاؤں۔
جب چاہوں پھِر سے چل دُوں۔
کاش کبھی یہ سب ہو
اور واپس پہنچنے کی کوئی جلدی نہ ہو۔

ہم کیوں دوڑ رہے ہیں

عجیب دوڑ ہے
ہر کوئی دوڑ رہا ہے
کوئی کار پر کوئی بس پر کوئی ٹرک پر کوئی ٹیکسی پر
کوئی آٹو رِکشا پر کوئی اِکّے تانگے پر کوئی سائکل رِکشا پر
ایک ٹانگ کی بیساکھی پر چلنے والا
اَور دو ٹانگ کی بیساکھی پر چلنے والا بھی
لکڑی کی چپٹی پر چھوٹے چھوٹے پہیئے لگا کر
رینگتے ہوئے چلنے والا بھی دوڑ میں شامِل ہے
زمین تو زمین آسمان میں ہوائی جہاز پر

ہزاروں خواہشیں ایسی

خراب سے خراب راستوں پر
فراٹے سے دوڑ سکنے والی
بڑھیا موٹر کے اسٹئیرِ نگ پر میرا ہاتھ ہو۔
ٹینکی پیٹرول سے لبالب ہو
کچی پکی اندیکھی انجانی سڑکوں پر
جب چاہوں جدھر چاہوں نِکل جاؤں آگے ہی آگے۔
جہاں چاہوں تیز رفتار سے چلوں
جہاں چاہوں خراماں خراماں
کِسی من بھاونی سُہاونی لُبھاونی بستی یا وادی میں
کِسی خوبصورت آبشار کِسی شفاف ندی
کِسی اچھی صورت کِسی اچھی سیرت کے قریب
جب چاہوں رُک جاؤں۔
جب چاہوں پھر سے چل دُوں۔
کاش کبھی یہ سب ہو
اور واپس پہنچنے کی کوئی جلدی نہ ہو۔

یہ مَیں اور یہ

میرا دھیان

جب تم میرے حق میں سزائے موت کا حکم سُنا رہے تھے
میرا دھیان کہیں اور تھا
جب تمہارے حکم سے مجھے پھانسی دی جا رہی تھی
میرا دھیان اُس وقت بھی کہیں اور تھا
آج ایک دُنیا کے باشِندے بلکہ کئی دُنیاؤں کے باشِندے
میرے پاس آ کر تمہارے خِلاف بہت کچھ کہتے ہیں
خاص طور سے یہ
کہ تم نے مجھے سزائے موت دے کر
بہت بڑی غلطی کی ہے بلکہ گناہ کِیا ہے
لیکن تمہارے خِلاف اِن تمام باتوں کے درمیان
میرا دھیان کہیں اور ہوتا ہے
یہ میرا دھیان اور یہ مَیں
ہم دونوں اَیسے ہی ہیں

اور پانی میں سمندری جہاز پر چلنے والے بھی
اِس دوڑ میں شامِل ہیں
سرپٹ دوڑ کے کُچھ نہ سُنائی دینے والے شور میں
کِسی کو یاد نہیں کہ وہ کیوں دوڑ رہا ہے
ہوسکتا ہے کُچھ لوگ اپنے انفرادی
اَور کُچھ لوگ اَپنے اِجتماعی نِشانوں کی طرف
دَوڑ رہے ہوں
ہر کوئی چاہتا ہے کہ وہ کوئی پل رُک کر کِسی سے پوچھے
کہ وہ کیوں دوڑ رہا ہے
لیکن ہر کوئی سوچتا ہے
کہ ایسا کرنے سے وہ پیچھے رہ جائے گا
اور دوسرے آگے نِکل جائیں گے بہُت آگے
لٰہذا ہر کوئی دوڑ رہا ہے
سرپٹ سرپٹ
بغیر یہ یاد رکھے کہ وہ کیوں دوڑ رہا ہے
بغیر یہ سوچے کہ وہ کیوں دوڑ رہا ہے

کُچھ حق اِن کا بھی ہے

سفر کے دوران
دُور دُور تک پھیلی ہوئی
کوئی بنجر قدیم دِکھائی دیتی ہے
تو سوچتا ہوں اِسے آباد کر دُوں
اِس پر ہل چلاؤں بلکہ ٹریکٹر چلاؤں
لیکن سفر کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں
اور پھِر بے شُمار پڑی ہیں اَیسی بنجر قدیم زمینیں
جِن میں ہل چلانے کی ضرورت ہے
فصل پَیدا کرنے کی گُنجائش ہے
مَیں کہاں کہاں پہنچوں
کہاں کہاں ہل چلاؤں ٹریکٹر چلاؤں
ہاں مگر اِن تمام بنجر قدیم زمینوں میں
ہل چلنے چاہئیں ٹریکٹر چلنے چاہئیں
اِن سب کو بھی آباد ہونا چاہیئے ۔

کیا یہ تمہیں ہو؟

آج فوٹو البم میں تمہاری تصویر دیکھتے ہوئے یوں لگا
جیسے مَیں نے تمہیں کبھی دھیان سے دیکھا ہی نہیں
کُچھ دیر کے لئے یہ دھوکہ ہُوا
گویا یہ تصویر تمہاری نہیں کِسی اور کی ہے
اور تصویر میں تمہاری نظر کے زاویئے کو دیکھ کر
محسوس ہُوا کہ تم جہاں تک دیکھ سکتی ہو
مَیں کبھی وہاں تک سوچ ہی نہ سکا
عُمر بھر ایسا کیوں ہوتا رہا؟
کیا اِس لئے کہ تمہارے چہرے پر جو جلال ہے
اُس نے مجھے کبھی تمہاری طرف غور سے دیکھنے ہی نہیں دِیا
یا پھِر روزمرّہ کی مصروفیات نے
ہمیں ایک دُوسرے کی طرف دیکھنے کی مہلت ہی نہ دی
یا پھِر اِس لِئے کہ ہم نے ایک دُوسرے کو
کبھی دھیان سے دیکھنے کے قابل ہی نہیں سمجھا

اندر باہر

بھرے پُرے شہروں میں
موٹر کاروں بسوں ٹرکوں ریل گاڑیوں کی بھاگم بھاگ میں
کہیں کوئی خستہ حال پُرانا قلعہ
اینٹ اینٹ اُکھڑتا ہُوا کوئی پُرانا محل
یا تاریخ کے پھٹے پُرانے میلے کچیلے
اُڑتے ہوئے اوراق کی طرح کوئی پُرانا کھنڈر
عین شہر کے بیچوں بیچ نظر آتا ہے
تو اُتر کر نیچے آجاتا ہوں داخل ہو جاتا ہوں
اندر کھو جاتا ہوں
باہر کی چہل پہل سے گویا کٹ جاتا ہوں
کِتنی کِتنی دیر غیر موجود کی سیر کرتے ہوئے جھٹکا لگتا ہے
جب میرا ہمزاد مجھے جگاتا ہے
یا شاید مَیں اُسے جگاتا ہوں
مَیں واپس اپنے اندر آجاتا ہوں
یا شاید اپنے اندر سے واپس باہر آجاتا ہوں

نہ ہو بانس
نہ بجے بانسُری

لمبے سفر کی گاڑی پر سوار ہونا ہی نہیں چاہیئے
دیر دیر تک ساتھ رہنے سے جذباتی لگاؤ سا ہو جاتا ہے
پھر اُترتے وقت
بچھڑتے وقت بڑی تکلیف ہوتی ہے
اچھّا تو یہی ہے
کہ چھوٹے چھوٹے سفر کی گاڑیاں پکڑی جائیں
یاد ہی نہ رہے کب، کس پہ چڑھے
کب، کس سے اُترے
کب، کس میں داخل ہوئے
کب، کس سے باہر آئے
نہ کوئی جذباتی لگاؤ نہ بچھڑنے کا غم
نہ ہو بانس نہ بجے بانسُری

کاش

اچانک دیوار میں دروازہ کھلا
مَیں اندر داخل ہو گیا
ایک کمرے میں گاتی مسکراتی ہوئی بہت سی عورتیں
سلائی مشین چلاتی ہوئی کپڑے سی رہی تھیں
مَیں تھوڑا آگے بڑھا
ایک اور کمرے میں بابو لوگ
خوشی خوشی اپنی دفتری کاروائیاں سرانجام دے رہے تھے
ایک دُوسرے کی طرف محبّانہ مسکراہٹیں بکھیرتے ہوئے
ایک اور کمرے میں
الگ الگ مذاہب کے چالیس پچاس افراد
ہنستے مسکراتے ہوئے

مَیں یدھشٹر نہیں ہوں

ہر دریا ہر آبشار ہر چشمے پر کوئی نہ کوئی یکش
اپنے اپنے سوال لِئے قابض ہے
اور پانی کو ہاتھ لگانے سے پہلے
اپنے سوالوں کے جواب دینے کی تلقین کر رہا ہے
مَیں کہ اِک تشنہ لب مسافر
پانی کے اِن خزینوں کے درمیان بھٹک رہا ہوں
سوالات کے جواب میرے پاس ہیں نہیں۔
پانی کو ہاتھ مَیں لگا نہیں سکتا۔
بھیم ارجُن نکُل اور سہدیو کے
حشر کو جانتا ہوں
لِہٰذا بھٹک رہا ہوں بھٹک رہا ہوں
بھٹک رہا ہوں تشنہ لب

شِکست کا نشہ

مِزاج کی تحریر کی تقریر کی
سوچ کی عمل کی کچھ خامیاں تھیں
جنھیں مَیں اپنی خوبیاں سمجھتا رہا
جِن پر مَیں ناز کرتا رہا
جو میرے لئے راحت بخش تھیں دُوسروں کے لئے تکلیف دہ
ایک عُمر کے بعد محسوس ہو رہا ہے کہ اگر مَیں نے
اپنی خامیوں پر وقتاً فوقتاً فخر نہ کِیا ہوتا
بلکہ اُن پر قابو پایا ہوتا
تو آج مَیں جہاں ہوں
اُس سے بہت آگے ہوتا
اب تو اِتنی مہلت ہی نہیں
کہ وہ سب دوبارہ ہو سکے
اب تو باقی بھی اُسی شان میں
گذر جائے تو اچھا ہے
کم سے کم دُوسروں کو تو پتہ نہیں چلے گا
کہ مَیں نے جِس نشے میں زِندگی گذار دی
وہ دراصل فتح کا نہیں بلکہ شِکست کا نشہ تھا

ایک دُوسرے کے ساتھ
کِسی مسئلے پر گفتگو کر رہے تھے
پھِر ایک اور کمرے میں کُچھ لوگ خوشی خوشی
دُور تک پھیلی ہوئی سڑک پہ روڑی پتھر کوٹ رہے تھے
اُن کے کپڑے صاف ستھرے اور بڑھیا تھے
عورتوں کے سروں پر بڑھیا دوپٹے تھے
اور مردوں نے بڑھیا رنگ برنگی پگڑیاں باندھ رکھی تھیں
اُس سے بھی آگے ایک کمرے میں
کچھ لوگ خوشی خوشی چمڑہ کاٹنے چمڑہ رنگنے
اور جوتیاں بنانے کا کام کر رہے تھے
اُن سب کے چہروں پر الٰہی نور برس رہا تھا
بالکل سنت روی داس کی طرح
اگلے دروازے میں داخل ہوتے ہی
مَیں اُس حویلی نما مکان سے باہر ہو گیا۔
آگے شاید دُنیا کا دُوسرا کنارہ تھا
پیچھے مُڑ کے دیکھا تو وہ حویلی نُما مکان
دُور دُور تک کہیں تھا ہی نہیں

خمارِ رفتہ

وقارِ رفتہ

پُرانا قِلعہ ہوں
چُپ چاپ اینٹ اینٹ اُکھڑتا رہتا ہوں
اپنی آنکھوں سے اپنے زوال کو دیکھتا رہتا ہوں لمحہ لمحہ
شِکوہ نہ شِکایت مَیں کِسی سے کچھ نہیں کہتا
پھِر کیوں یہ کچھ لوگ آجاتے ہیں مجھے پریشان کرنے کو
تعمیرِ نو تشکیلِ نو تجدیدِ نو
یعنی میری ازسرِ نو تکمیل کے نام پر
میری خستہ حالی سے چھیڑ چھاڑ کرنے کو
میرے زخموں کو کریدنے کے لِئے
میری اپنی قِسم کی ساخت کو بے ساخت کرنے کے لِئے۔
مان لو اگر یہ مرمّت کر کے مجھے نیا جیسا بنا بھی دیں
تو بھی کیا بھروسہ ہے
کہ میرے اندر وہ اعتبار وہ اعتماد بھی لوٹ آئے گا
جو اُس عہد سے وابستہ ہے جو میرا عہد تھا۔

میری جنگ

تاریخ مجھے اپنی طرف کھینچ رہی ہے
بُلا رہی ہے پُکار رہی ہے۔
اپنے ساتھ بہالے جانا چاہتی ہے۔
لیکن مَیں اپنی الگ راہ نِکالنا چاہتا ہوں۔
بادِ مخالِف کے خِلاف اُڑنا چاہتا ہوں
موجِ مخالف کے خِلاف تیرنا چاہتا ہوں
لغزشیں ہیں تھپیڑے ہیں ناکامیاں ہیں
لیکن قدم قدم نئے اِرادے بھی ہیں۔
اندر سے باہر کی طرف ہِمّت کا بہاؤ بھی ہے۔
ہار نہ ماننے کا مُسمّم اِرادہ بھی ہے۔
بے شک تاریخ کے صفحات میں میرا نام سنہرے تو کیا
کالے حُروف میں بھی نظر نہیں آئے گا۔
لیکن مَیں اپنے اندر جانتا ہوں
کہ تاریخ کے بہاؤ کے خِلاف میری جنگ
تاریخ سے زیادہ اہمیت کی حامِل ہے۔

شاید اِن کی دیکھا دیکھی

پہلے مَیں لِباس پہن کر رکھتا تھا
کبھی بے لِباس نہیں رہتا تھا
دُوسروں کے سامنے کیا
اکیلے میں بھی چڈّی تو پہن کر ہی رکھتا تھا۔
لیکن جب سے اِس جنگل میں آیا ہوں
دیکھ رہا ہوں شیر بھیڑیا لومڑی بندر
ریچھ جِراف سبھی ننگے ہیں۔
یہاں تک کہ گیدڑ اور بھیگی بِلّی بھی
ننگے گھوم رہے ہیں الِف ننگے
اپنے اپنے کام میں مگن
کِسی کو فرصت نہیں کہ وہ یہ دیکھ سکے
یا اِس بات پر غور کر سکے
کہ مَیں جو یہاں بالباس آیا تھا
اِس جنگل میں مَیں بھی ننگا ہو چکا ہوں
شاید اِن کی دیکھا دیکھی۔

میری تنہائی میرا بہترین ساتھی

میری تنہائی میرا بہترین ساتھی ہے۔
اِس کے سامنے مَیں بات بے بات رو سکتا ہوں۔
کھِلکھِلا کر ہنس سکتا ہوں اَلِف ننگا ہو سکتا ہوں
اِس کے سامنے بڑبڑا سکتا ہوں بُڑبُڑا سکتا ہوں
اپنے آپ سے باتیں کر سکتا ہوں
اپنی ذات کو اُونچی آواز میں پکار سکتا ہوں
اپنے جِسم سے پیار بھی کر سکتا ہوں
بے شک میرے چاہنے والے بے شمار ہیں
کچھ تو مجھ پر جان چھِڑکتے ہیں
لیکن اُن میں اَیسا کوئی نہیں
جِس کے سامنے مَیں یہ سب
جب چاہوں کروں
اور اُسے کوئی تامّل نہ ہو۔

شنکر شاکا

تمہارا کیا ہے
بھیس بدلا شنکر بھلے مانس بن گئے
بھیس بدلا شاکا بدمعاش بن گئے

ہماری بات اور ہے
ہم پردۂ سیمیں کے نہیں بلکہ زِندگی کے کِردار ہیں
کئی کئی جنم لگ جاتے ہیں شاکا سے شنکر بننے میں
اور پھِر ایک جنم سے دوسرے جنم تک
کِسے یاد رہتا ہے
کِس جنم میں کوئی شاکا تھا کِس جنم میں شنکر
ہر موقعے کے مطابق بدل جانا تمہارے لِئے آسان ہے
ہمارے لِئے مُشکل ہے بہت مُشکل قریب قریب ناممکن۔

ایک تصویر میرے البم میں

اپنی تصویروں کے بند پڑے البم کو
وقتاً فوقتاً کھولتا ہوں
ایک ایک تصویر کو بغور دیکھتا ہوں۔
ایک تصویر جو میرے البم میں دراصل نہیں ہے
نہ جانے کہاں سے آجاتی ہے
کبھی اِس ورق پر کبھی اُس ورق پر۔
یہ تصویر میری البم کے قریب قریب ہر ورق پر
کبھی نہ کبھی اپنی نمائش کر چکی ہے۔
البم سے باہر یاد کرنے پر
دماغ پر بہُت زور دینے پر بھی
یاد نہیں آتا
کہ یہ تصویر کس کی ہے؟

جیسے مَیں اُجلا ہوں
جیسے مَیں جمیل ہوں
جیسے مَیں روشن ہوں
جیسے مَیں پیارا ہوں
بہت ہی پیارا۔
پھر اُس کے بعد دوبارہ
تولیا بدن پر باندھنے کا دِل ہی نہیں ہُوا۔
دیر تک مَیں اپنی داڑھی پر بُرش چلاتا رہا
اور سوچتا رہا کہ کاش کبھی تم بھی یونہی میرے ساتھ
غُسل خانے سے نہا دھو کر نکلو
دونوں کے بدن پر باندھے ہوئے تولیئے
یوں ہی آئینے کے سامنے پھِسل کر گر جائیں
اور ہمیں یہ محسوس ہو سکے
کہ جب ہم نے سفر شروع کیا تھا
اُس وقت ہم کیسے دِکھائی دیتے تھے۔

دہر میں
باغِ عدن
یاد آیا

آج صبح غسل خانے سے نہا دھو کر نکلا
اندر کمرے میں آ کر آئینے کے سامنے
حسبِ معمول اپنی داڑھی پر برُش چلا رہا تھا
کہ بدن پر باندھا ہوُا تولیا اچانک پھِسل کر نیچے گر گیا
اور مَیں آئینے کے سامنے اِلف ننگا ہو گیا۔
اچانک اپنے آپ کو یوں دیکھ کر
پہلی بار محسوس ہوا جیسے مَیں مُکمّل ہوں
جیسے مَیں اصل ہوں

جِسم لِباس اور مَیں

جب جِسم میں دم تھا
لِباس کیسا ہے یہ فِکر ہی نہ تھی
جِسم کا اپنا مزاج تھا ایک نخرہ تھا
مست ہاتھی کی سی چال تھی
اب جِسم لاغر ہے
بڑھیا سے بڑھیا نئے سے نئے انداز کے
شوخ سے شوخ رنگوں کے خوبصورت لِباس میں
جِسم کو سجا کر نِکلتا ہوں
لِباس کی مدد سے وہی انداز وہی مِزاج وہی دم خم
اپنے جِسم میں پیدا کرنے کی کوشش میں رہتا ہوں
سامنے والوں کی نظر پر نظر رکھتا ہوں
کہ اُن کا دھیان میرے لِباس پر مرکوز رہے
میرے جِسم پر نہیں
جو میرے لِباس کے اندر پوشیدہ ہے

ایک چھلانگ

صِرف ایک چھلانگ

میری اپنی ایک شکل ہے الگ پہچان ہے
مگر مَیں ایک ایسی اقلیت سے تعلق رکھتا ہوں
جو اکثریتی ہجوموں کے درمیان کہیں نظر ہی نہیں آتی ۔
لٰہذا میری شکل بے معنی میری پہچان بے سود
ایک چھلانگ لگاؤں
تو اقلیت سے اکثریت میں شامِل ہو جاوں
ہجوم صورت ہو جاؤں
چہرہ چہرہ نظر آنے لگوں
ہر سمت مَیں ہی مَیں ہو جاؤں
لیکن مَیں اَیسا ہر گز نہیں کروں گا
اپنی مخصوص شکل کو
اپنی الگ پہچان کو برقرار رکھوں گا
چاہے اکثریتی ہجوموں کے درمیان کہیں
نظر آؤں یا نہ آؤں ۔

حرکات وسکنات کے لِئے
مرا ہوں نہ مروں گا
مَیں تو زِندہ ہوں
فرانز کافِکا کی عُمر گزار کر بھی
زِندہ ہوں
اور زِندہ رہوں گا
اپنی تمام تر نفسِیاتی الجھنوں
اپنے سارے احساسِ کمتری
اپنی ساری باطِنی کم مائیگی
اپنی بظاہر دبنگ اَور بباطن دبّو شخصیت کے ساتھ
مَیں صبحوں کو خوش آمدید کہتا ہوں
کہتا رہوں گا
اپنی شاموں کو رنگین کرتا ہوں کرتا رہوں گا
اور اِس بیچ میں آنے والے ہر دِن کو
لمحہ لمحہ جیتا رہوں گا لمحہ لمحہ مرتا رہوں گا
فرانز کافِکا پرلے درجے کا بیوقوف تھا
مَیں پرلے درجے کا بیوقوف نہیں ہوں۔

فرانز کافکا
پرلے درجے کا
بیوقوف تھا

فرانز کافکا پرلے درجے کا بیوقوف تھا
جو اپنے باپ کی زیادتیوں کی وجہ سے مر گیا
لیکن اپنی سُہانی صبحوں اَور رنگین شاموں کے درمیان
نِت نئے رنگ بدلتے ہوئے لمحوں کے لِئے جی نہ سکا
مَیں بیوقوف نہیں ہوں
مَیں اپنے بڑے بھائی کی
یا شاید اپنے باپ کی
یا شاید اپنے کِسی چچا خالو
یا شاید کِسی دُور یا نزدیک کے رِشتہ دار کی
کوفت ساماں بلکہ عذاب ساماں

جھیل اُداس
پہاڑ اُداس

جھیل اُداس پہاڑ اُداس
صنوبر اُداس سبزہ اُداس
برف اُداس جھرنا اُداس
سفید پھول اُداس کاسنی اُداس
نیلے اُداس ہیں
کالے اُداس اور سنہرے اُداس ہیں
سیر گاہ میں داخل ہوتے ہی
مجھے محسوس ہوُا جیسے مناظر کی اُداسی
میرے اندر بھی داخل ہونے لگی ہے
لیکن یہاں تھوڑے قیام کے بعد معلوم ہُوا
کہ یہ میرے اندر کی اُداسی ہے
جو دراصل درخت پہاڑ جھیل سب کو
ایک ایک کرکے اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے

دُور اُس

آخری جزیرے پر

سَو رُوپے کا ٹِکٹ خریدوں گا، دس کروڑ کی لاٹری لگے گی
سمندر میں دور کہیں کوئی غیر آباد جزیرہ خریدوں گا
اُسے آباد کروں گا اُس پر حکومت کروں گا
اپنی ایک دُنیا بساؤں گا جس پر میرا راج ہوگا
بے روک ٹوک راج
ہاں مگر یہ سَو رُوپے جو میرے پاس ہیں
کیا مَیں اِن کا ٹِکٹ خریدلوں گا
اَور اگر ٹِکٹ خرید بھی لیا
تو کیا میری دس کروڑ کی لاٹری لگ جائے گی؟
اور اگر لاٹری لگ بھی گئی
تو کیا مَیں کوئی غیر آباد جزیرہ خرید سکوں گا؟
جزیرہ اگر خرید بھی لیا تو کیا اُسے آباد کر پاؤں گا؟
اَور اگر آباد کر بھی لیا
تو کیا اُس پر راج کر سکوں گا؟ بے روک ٹوک راج؟

اِک بُرا خواب

مَیں نے دیکھا کہ مشعلیں ہاتھوں میں لئے ہوئے
فسادیوں کا ایک ہجوم میرے پیچھے دوڑ رہا ہے
اور مَیں آگے آگے بھاگ رہا ہوں
پھِر مَیں نے دیکھا کہ بھاگتے بھاگتے ہانپتے ہانپتے
مَیں گورودوارے میں جا چھپا بلکہ جا گِرا
مَیں نے یہ بھی دیکھا کہ موقع پا کر
مَیں گورودوارے کے کِسی پچھلے دروازے سے
بھاگ نِکلا اور جان بچا کر ایک محفوظ پہاڑ پر جا چڑھا
اور پھِر سانس برابر کرتے ہوئے
مَیں نے دیکھا کہ میرے پیچھے وہ گورودوارہ
جل بُجھے ہوئے ایک کالے سے کھنڈر میں تبدیل ہو گیا۔
وہ گورودوارہ جس کی حفاظت کے لئے
کبھی میرے بُزرگوں نے لاثانی قربانیاں دی تھیں

اپنے اپنے چوکھٹوں میں

اِس نِگار خانے کی دیواروں پر لٹکی ہوئی
اپنے اپنے چوکھٹوں میں قید تصویریں
چوکھٹوں سے باہر نہیں آسکتیں
لیکن ایک دُوسرے کی طرف دیکھ سکتی ہیں
متوجہ تو ہوسکتی ہیں
بلکہ خوابوں خیالوں میں چوکھٹوں سے باہر آ کر
ایک دوسرے سے اکثر مِلتی جُلتی رہتی ہیں
نئے سے نئے عجیب وغریب
ناممکن دِکھائی دینے والے
رِشتے گروہ ٹولے بنالیتی ہیں
ہاں ہاں جوڑیاں بھی
لیکن خواب وخیال سے واپس
اپنے اپنے چوکھٹوں کی طرف آتے ہوئے
اُنہیں معلوم ہوتا ہے کہ
خواب فقط خواب ہیں
اور خیال فقط خیال

مکڑ جال

دُوسروں کی کہانیاں سُنتے سُناتے
اِس بات کا خیال ہی نہ تھا
کہ میرے اپنے اِرد گرد
کئی کئی کہانیاں بُنی جا رہی ہیں
سُنی جا رہی ہیں سُنائی جا رہی ہیں
اور جب تک اِس بات کا پتہ چلا
میرے اِرد گرد
کہانیوں کے تانے بانے
اِتنے اُلجھ چکے تھے
کہ اُن سے باہر نِکل پانا ممکن ہی نہیں تھا

غصّہ بنام غصّہ

جنگلوں میں شہر بسانے کے لِئے
ہم نے جِن جانوروں کو دُور دُور کھدیڑ دِیا
وہ اپنی گمشدہ جنت کی تلاش میں
کبھی کبھار ہمارے شہروں پر حملہ کرتے ہیں
ہمیں اِس بات پر غُصّہ آتا ہے
کہ یہ جانور خواہ مخواہ ہمارے شہروں پر
حملہ کر دیتے ہیں۔
اُنہیں اِس بات پر غُصّہ آتا ہے
کہ ہم نے اُن سے اُن کی پناہ گاہیں چھین کر
اُنہیں بےگھر بدر کر رکھا ہے

پردیس میں

مَیں کسی دُوسرے دیس میں
اپنے دیس کا سفیر ہوں
ویسے سفارت تو میرا بالواسطہ کام ہے
بلاواسطہ میرا کام کُچھ اور ہی ہے۔
اور وہی دراصل میرا کام ہے۔
اِس پردیس میں جو خُفیہ کام کرتا ہوں
وہ مَیں یہاں کسی کو بتا نہیں سکتا۔
جو کام مَیں یہاں لوگوں کو بتا کے کرتا ہوں
وہ دراصل میرا کام ہے ہی نہیں۔
وہ تو بس ایک چھلاوہ ہے دِکھاوا ہے
ایک پردہ ہے یا شاید ایک دھوکہ
مَیں اپنے اصل کام پر کسی کے سامنے فخر کرسکتا ہوں
نہ میرے دیس کی سرکار اُس کے لئے کھُلے بندوں
مجھے شاباش دے سکتی ہے

تمہیں نہیں معلوم

تمہیں نہیں معلوم کہ تمہارے ساتھ سفر میں
مَیں تم سے بہُت آگے نِکل چکا ہوں۔
مَیں جانتا ہوں کہ تم اپنے ساتھ
مجھے جہاں سمجھتی ہو
مَیں تمہارے ساتھ وہاں نہیں ہوں
بلکہ مَیں تمہارے ساتھ
وہاں سے بہُت آگے نِکل چکا ہوں۔
لیکن مَیں یہ سب تمہیں نہیں سمجھا سکتا
کیونکہ اگر یہ سب تمہاری سمجھ میں آ گیا
تو تم کہیں یہ نہ سمجھ لو
کہ مَیں تمہارے ساتھ ہوں ہی نہیں
بلکہ بہُت آگے نِکل چکا ہوں
اور تم پیچھے رہ گئی ہو
کہیں بہُت پیچھے

بینڈ ماسٹر

جشنِ آزادی جاری ہے
پریڈ میں طرح طرح کی ٹکڑیاں
اپنے اپنے کرتب دِکھاتی ہوئی سامنے سے گذر رہی ہیں۔
اور اب خوبصورت رنگا رنگ بینڈ
الگ الگ قِسم کے سازوں اور سازِندوں کے ساتھ
قدم قدم آگے بڑھ رہا ہے۔
بانسری بجانے والوں کے مُنہ
بانسری میں لگاتار ہوا بھرنے کی وجہ سے
پھولے جارہے ہیں۔
ڈھول ڈرم بجانے والوں کے ہاتھ
لگاتار ڈم ڈم بجنے کی وجہ سے تھکتے جارہے ہیں۔
بیگ پائپر اور بگل بجانے والوں کے مُنہ تو
ہوا بھر بھر کے جیسے ٹیڑھے میڑھے ہوئے جارہے ہیں
سبھی کے سبھی تھکے ماندے اُداس بے زار

دُنیاداری پُرکاری

تمہاری طرح کُچھ دوسرے لوگ بھی یہ کہتے ہیں
کہ مَیں مست ہاتھی کی طرح چلتا ہوں
خراماں خراماں جھومتے ہوئے
لہراتے ہوئے، کسی اندرونی خمار میں مگن
سُنو میری مست چال کا راز
میری ایک ٹانگ میں دراصل کُچھ نقص ہے
جِس کی وجہ سے میری چال میں
لڑکھڑاہٹ سی آگئی ہے
اور مَیں نے اِس لڑکھڑاہٹ کو
کُچھ اِس طرح سے اِستعمال کرنا سیکھ لِیا ہے
کہ لنگڑا کے چلنے کے بجائے
مَیں مست ہاتھی کی طرح
جھومتا ہوا لہراتا ہوا
بل کھا کے چلتا ہوا
نظر آتا ہوں ۔

ماں تُجھے سلام

اپنے خمیر سے مَیں نوری ہوں نہ ناری
خاکی ہوں خالِص خاکی
خاک سے پَیدا ہُوا ہوں
خاک سے اُٹھا ہوں خاک میں ہی فنا ہو جاؤں گا
مَیں آفتاب سے اُس کی دھوپ سے
میری زِندگی پر اُس کے اثرات سے اِنکار نہیں کرتا
مَیں چمکتے چاند سے اور ٹمٹماتے ہوئے تاروں سے
اُن کی چال سے میری زِندگی پر پڑنے والے
اثرات سے بھی اِنکار نہیں کرتا۔
اِن سب سے پرے اِن سب کو چلانے والی
طاقت کے وجود سے بھی مجھے اِنکار نہیں ہے
لیکن یہ حقیقت بھی مُسلّم ہے کہ اِس سب کے باوجود
اپنے خمیر سے مَیں نوری ہوں نہ ناری
بلکہ خاکی ہوں خالِص خاکی
خاک سے میری بقا ہے خاک میں میری فنا ہے
خاک سے میری انا ہے۔

قدم سے قدم مِلا کر چلنے کی کوشش کرتے ہوئے
گویا بمشکل اپنا اپنا کام سرانجام دے رہے ہیں
ہاں مگر بینڈ ماسٹر
اپنی رنگ برنگی خوبصورت چھڑی کو
ہوا میں اُچھالنے کے الگ الگ کرتب دِکھاتا ہوا
خوشی خوشی سب سے آگے چل رہا ہے
اُس کے قدموں میں بلا کا جوش ہے
اُس کی آنکھوں میں بلا کی مستی ہے
اُس کی چھڑی میں کمال کا رقص ہے۔
وہ بانسری بجاتا ہے نہ ڈھول ڈرم
نہ بیگ پائیپر نہ بِگل
خُدا جانے اُسے اِن میں سے کوئی ساز
بجانا آتا بھی ہے یا نہیں
لیکن وہ اپنی حرکتوں سے یہ ظاہر کرتا ہے
کہ وہ سب سازوں کا ماسٹر ہے
سب سازِندوں کا اُستاد ہے۔

یہ کہانی ان کہی رہ جائے گی

ایک مُدّت سے یہ کہانی
اپنے سینے میں دبائے پھِرتا ہوں۔
یہ کہانی جِسے بھی سُنانی چاہی
اُسی نے اُدھر سے اپنی داستان شروع کر دی۔
چرند پرند جنگل پہاڑ چاند سِتارے پھول کلیاں
آدمی جانور درخت
یہاں تک کہ اپنی تنہائی کو بھی
جب یہ روداد سُنانی چاہی
تو اُس نے اُدھر سے اپنی کہانی چھیڑ دی۔
دُوسروں کی داستانیں سُنتے سُنتے عُمر ہو گئی۔
یہ زندگی بلکہ آنے والی کئی زندگیاں
یوں ہی گذر جائیں گی
یہ کہانی ان کہی رہ جائے گی

عُمر قید کے بعد

عُمر قید کے دَوران آزادی کی خواہش تھی
آرزو تھی زِندان سے باہر
بھری دُنیا میں بے باک بے خوف گھومنے کی
آزاد پرندوں کی طرح اُڑنے کی
آزاد جانوروں کی طرح
جنگل جنگل بے رُکے سفر کرنے کی۔

سزا ختم ہونے پر
قید خانے کے بڑے دروازے سے باہر نکلتے ہی
آزادی کی تمام خواہشیں گویا کافور ہو گئیں
باہر کا ناسازگار ماحول دیکھ کر
مَیں واپس زِنداں کی طرف لپکا ہی تھا
کہ زِنداں کا بڑا دروازہ بند پایا
بلکہ زِنداں کا بڑا دروازہ وہاں تھا ہی نہیں
بلکہ اُس زِنداں کا دور دور تک نام و نِشاں ہی نہ تھا

مَیں یہ سب ضرُور کرُوں گا

اِس بھیڑ بھاڑ بھرے مہانگر میں
ایسی جگہ کہاں ہے
جہاں مَیں آزاد پنچھیوں کی طرح اُڑتا پھِروں
درختوں سے لپٹ لپٹ کر
اُونچی اُونچی آواز میں روؤں ہنسوں
نغمے گاؤں ناچتا پھِروں
قُدرت سے مکالمہ کروں
خود سُنوں خُدا کو سُناؤں
مَیں جانتا ہوں کہ ایسا کرنے والے کو
یہ مہذّب دُنیا دیوانہ ہی کہے گی
لیکن پھر بھی اِس مہانگر میں
کِسی بھی مہانگر میں
کہیں بھی ایسی کوئی جگہ مِل جائے
تو مَیں یہ سب ضرور کروں گا۔

کُچھ بھی تو اچھا نہیں ہے

سارے جاگیردار اپنی اپنی جگہ خودمختار بنے بیٹھے ہیں
اپنی اپنی حکومت
اپنی اپنی مرضی کے مُطابق چلا رہے ہیں۔
جہاں جس کا زور چلتا ہے وہ چلاتا ہے۔
جہاں جس کا داؤ چلتا ہے وہ چلاتا ہے۔
کوئی کِسی کو جانتا ہے نہ کوئی کِسی کو مانتا ہے
عجب رواروی کا عالم ہے۔
حاکمِ اعلیٰ بادشاہ سلامت۔ مست الست
کِسی جاگیردار کو جانتے ہیں نہ پہچانتے ہیں۔
وہ سمجھتے ہیں کہ سب اچھا ہے
جب کہ سب اچھا نہیں ہے
بلکہ کچھ بھی اچھا نہیں ہے

ہم شِکاریوں کی نسل سے ہیں

ہم شِکارِیوں کی نسل سے ہیں
فِطرتاً سبھی شِکاری ہیں
بظاہر برادری ہے بھائی چارہ ہے
بباطن مگر ایک دُوسرے سے خائف رہتے ہیں
کیونکہ شِکار کرنے سے ہم نہیں چوکتے
جہاں بھی داؤ لگے
شِکار چاہے کِسی ہم نَسل کا ہی کیوں نہ ہو
اِس بظاہر باہمی اعتماد
اور بباطن باہمی بے اعتمادی کے درمیان
نُقصان میں رہتے ہیں وہ جو ہم میں کم بہُت کم ہیں
جو شِکاریوں کی نَسل سے ہوتے ہوئے بھی
شِکاری نہیں ہیں۔
اُن کا سب سے بڑا المیہ تو یہ ہے
کہ کوئی مانتا ہی نہیں کہ وہ شِکاری نہیں ہیں۔

اُٹھو چلو

مَیں جانتا ہوں
اب یہاں میرے کرنے لائق کچھ نہیں ہے
لیکن مَیں فالج زدہ زِندگی نہیں جی سکتا
یہاں سے نِکلوں گا
ہاتھ پاؤں ہلاؤں گا
اعصاب کو حرکت میں لاؤں گا
جہاں بھی کچھ کرنے لائق ہوگا کروں گا
چاہے وہ میرے دست و پا کی
بے جا حرکت ہی کیوں نہ ہو
مَیں جانتا ہوں
جب مَیں کچھ کروں گا
تو کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا

تمہارا بَیل ہوں

تمہارا بَیل ہوں تمہارا ہل چلا رہا ہوں
تمہاری بَیل گاڑی کے آگے لگ کر
تمہارا بوجھا بھی ڈھو رہا ہوں
تم سے ڈنڈے چھانٹے بھی کھا رہا ہوں۔
پِھر بھی تمہاری غلامی سے کبھی اُکتاہٹ نہیں ہوتی۔
مَیں نے کبھی بغاوت کے لئے سوچا بھی نہیں
حالانکہ تم جانتے ہو
میرے سینگ کِتنے خطرناک سیدھے لمبے اور تیکھے ہیں۔
کِسی کے بھی پیٹ میں گھُس جائیں تو آر پار ہو جائیں۔
پِھر زِندہ بچنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔
لیکن مَیں نے کبھی اَیسا سوچا ہی نہیں
ایسا کرنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔
تم بے فِکر ہو کر اپنا ڈنڈا چلاتے رہو
چھانٹا چلاتے رہو
کوئی پروا نہیں۔

سوچ کے پنکھ
دُعا کے پنکھ

بچپن میں یا شاید اُس سے بھی پہلے
یا شاید اُس سے بھی بہت پہلے
مَیں اپنی دُعاؤں میں اکثر کہا کرتا تھا
اے کہ میری سوچ کو پنکھ لگا دے
تا کہ مَیں آسمانوں میں خلاؤں میں
اور آگے اور اُونچا اُڑ سکوں
آج سوچتا ہوں
پنکھ تو اُس نے میری سوچ کو پہلے ہی دے دئے تھے
اِسی لئے تو مَیں خلاؤں میں آسمانوں میں
اور آگے اور اُونچا اُڑنے کی دُعا کرتا تھا
دراصل میرا تجربہ کہتا ہے
کہ دُعا سے زیادہ طاقت ور بال و پر
کسی پرندے کے نہیں ہوتے

کالا کوّا ہی کیوں

صُبح ناشتہ کرتے ہوئے مَیں نے دیکھا
کالا کوّا میری پیٹھ پیچھے آم کے درخت پر بیٹھا ہُوا
کاؤ کاؤ کر رہا ہے
مَیں نے روٹی کے دو چار ٹکڑے پھینک دِیے
وہ نیچے آیا ڈرتے ڈرتے
چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتا ہُوا آگے بڑھا
شاید سوچ رہا تھا کہ مَیں کوئی شِکاری ہوں
روٹی کا ٹکڑا ڈال کر اُس کا شِکار کر لوں گا
اُسے نہیں معلوم کہ مَیں شِکاری نہیں ہوں
اور اگر ہوتا بھی تو کالا کوّا ہی کیوں
رنگ رنگ کے پرِندے ہیں
درختوں پر ہواؤں میں جھیلوں کے آس پاس
اور پھِر اگر کالے پرِندے کا ہی شِکار کرنا ہوتا
تو کالی کوئل ہے، کالی تیتری ہے کالی چڑیا ہے
کالا کوّا ہی کیوں؟

باہوش وحواس مَیں آج عین اِس وقت
یہ قسم کھاتا ہوں کہ اب مَیں وہ نہیں رہوں گا جو پہلے تھا
اور کُچھ بن جاؤں گا
اب مَیں کسی کو یہ اجازت نہ دوں گا کہ وہ مجھے
کِسی جلسے، کِسی جلوس، کِسی گُٹ، کِسی ٹولے میں
جب چاہے ہانک لے جائے
مَیں کِسی کو یہ حق نہ دوں گا
کہ وہ مجھ سے میری مرضی کے خِلاف کوئی نعرہ لگوا سکے
مَیں قسم کھاتا ہوں اب کوئی بات بے بات
میرے جذبات کو بھڑکا کر میرا استحصال نہیں کر سکے گا
مَیں یہ بھی قسم اُٹھاتا ہوں کہ آج سے
دُور دُور تک پھیلی ہوئی اپنی ضروریات کو
اِتنا سمیٹ لوں گا کہ اُنہیں پورا کرنے کے لئے
مجھے کِسی کی مدد کی ضرورت نہ پڑے
مَیں یہ بھی قسم اُٹھاتا ہوں کہ میری خواہشات
جو ہر وقت میرے دِل کے گھوڑے پر سوار رہتی ہیں
مَیں اُنہیں پٹخنی دے کر نیچے اُتار پھینکوں گا
اور آزاد ہو جاؤں گا

اب
مَیں
وہ
نہیں
رہوں
گا

رنگ رنگ کے رنگ

پسندیدہ رنگ؟
کیا بتاؤں رنگ تو کئی ہیں پسندیدہ
مثلاً نیلا آسمانی کھُلا ہوُا دُور دُور راحت بخش۔
اور پھِر زرد پیلا بھی محض سوکھے پتّوں کا رنگ نہیں ہے۔
سونے کا رنگ ہے سنہری چمکیلا تیاّر فصلوں کا رنگ ہے۔
سردیوں کی دھوپ کا رنگ ہے۔
اور بھی رنگ ہیں سُہاونے من موہنے لبھاونے
سبز سُرخ کاسنی پیازی گاجری گُلابی
دوُدھیا سفید وغیرہ وغیرہ۔
ایک سے ایک دِلکش ایک سے ایک جاذبِ نظر
دعوتِ نظاّرہ دیتے ہوئے۔
کِسی ایک رنگ کا نام کیسے لوں
جبکہ مَیں خود رنگ رنگ وجود ہوں۔
سات رنگوں کی ہی نہیں
بلکہ کئی کئی رنگوں کی قوسِ قزح ہوں۔

پردۂ سیمیں کے اندر

پردہ سیمیں پر ناچ ہو رہا تھا
رنگ برنگی لڑکیاں سمندر کنارے
ہندوستانی کلاسیکی موسیقی پر
کتھک یا بھرت ناٹیم یا کتھا کلی یا کسی لوک ناچ
یا شاید کسی جنگلی رقص کی دلکش اداؤں پر ناچ رہی تھیں۔
پانی میرے مُنہ میں بھر آیا
مجھ سے رہا نہ گیا تو مَیں اُٹھ کر آگے بڑھا
اور پردۂ سیمیں کے اندر داخل ہو گیا
مَیں نے ہر لڑکی کے تال سے تال مِلانے کی کوشش کی
لیکن کوئی تال مِلا نہ کوئی آنکھ مِلی
نہ کسی نے میری آواز سُنی نہ کسی نے میری پرواہ کی
جیسے مَیں وہاں تھا ہی نہیں
پھر اچانک مجھے واپسی کا خیال آیا
پیچھے مُڑ کر دیکھا تو کوئی پردۂ سیمیں ہی تھا
نہ کوئی ناچ تھا نہ کوئی تال
نہ کوئی موسیقی تھی نہ کوئی سمندر تھا نہ لڑکیاں
تھا تو بس مَیں ہی مَیں اُوپر نیچے دائیں بائیں آگے پیچھے
اور ہاں دُور دُور تک خلا تھا یا خلا تھی

تو تم اپنی زِندگی سے بےزار ہو سکتے ہو۔
تمہاری کچھ باتیں تو ایسی ہوتی ہیں
جِن کے جواب تمہیں
میرے سامنے ننگا کر سکتے ہیں۔
کبھی کبھی تو تمہارے سوال ایسے ہوتے ہیں
جنہیں سُن کر مَیں اپنی ہنسی کو
بڑی مُشکل سے روک پاتا ہوں۔
جواب دینے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔
تم تو مجھے محض اپنا ماتحت بلکہ اپنا غُلام جانتے ہو
لیکن مَیں تمہارا خیر خواہ بھی ہوں
نہ مَیں تمہیں ننگا کرنا چاہتا ہوں
نہ تمہیں زِندگی سے بےزار ہونے دینا چاہتا ہوں۔
نہ مَیں یہ چاہتا ہوں کہ تم خواہ مخواہ
دِل کے دورے کے شِکار ہو جاؤ۔
اور نہ ہی مَیں یہ چاہتا ہوں
کہ تمہیں اپنی نااہلیت کا عِلم ہو
کیونکہ اُس سے بھی تمہارا دِل ٹوٹ سکتا ہے۔

نیک خواہشات کے ساتھ

تمہارا فقط تمہارا

تمہاری آدھی سے زیادہ باتوں
اور تمہارے آدھے سے زیادہ سوالوں کے جواب
میرے اندر ہی رہ جاتے ہیں۔
مَیں جانتا ہوں کہ تمہیں یہ گمان ہے
کہ مَیں تمہارے سامنے لاجواب ہو جاتا ہوں
لیکن ایسا نہیں ہے
دراصل تمہاری کُچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں
جن کے جواب اگر مَیں دے دوں
تو تمہیں دِل کا دورہ پڑ سکتا ہے۔
تمہارے کُچھ سوال ایسے ہوتے ہیں
جن کے جواب اگر مَیں دے دوں

فتحِ باب

بجا کہ تم نے مجھے شِکست دے دی
مَیں ہار گیا لیکن مَیں مرا نہیں
زِندہ ہوں دوبارہ اُٹھوں گا
پھِر سے اپنی طاقت بٹوروں گا۔
لڑوں گا لڑائی جاری رکھوں گا
جب تک زِندہ ہوں۔
یعنی جب تک مَیں مرنہیں جاتا۔
تم میری جس شِکست کو
میری موت سمجھتے ہو
وہ میری موت نہیں ہے
میری موت تو میری فتح ہو گی
میری شِکست نہیں۔

یہ نہیں چلے گا

یہ نہیں چلے گا کہ کوئی بھی کیڑا مکوڑا
ہمارے پاؤں ہماری ٹانگ پر اُچھل کود کرتا رہے
چھوٹے موٹے ڈنک مار کر
ہمارا خون چوستا رہے عیّاشی کرتا رہے
جب بھی معمولی سے معمولی درد ہوگا
یا چھوٹی موٹی چُبھن محسوس ہوگی
اِن کیڑے مکوڑوں کو
ہاتھوں سے یا چھوٹی موٹی کِسی چیز سے
جھاڑ پھونک کر اُڑا دیں گے بھگا دیں گے۔
اور بھاگم بھاگ میں
اگر کچھ کیڑے مکوڑے مارے جاتے ہیں
تو اِس میں ہمارا کیا قصور

سادھوے

جوگی رے
تم کاہے الکھ جگاؤ ہو بھور سویرے۔
مورے منوا سووت اگن جگائے کے
بھِکشا لیت چلت ہو اُونچ پہاڑے۔
اپنی لگن مگن ہو سانجھ سویرے
تم کیا جانو
ہم دِن رکس بِدھ کاٹے۔
تُمری لولاگی ہے زراکار سوں
ہمرے من آکار تُہار براجے۔
جوگی تم آکاش کی سُرت کرو ہو
دھرتی پر جو بیتے وہ نہیں سمجھے۔
من انتس کی سار کبھو نہ جانے
اُونچے پربت سدھ سمادھ تہارے

رفت کیا چیز
بود کیا شے ہے

مَیں نہیں جانتا
کِسی بحرِ بیکراں میں ہوں یا کِسی خلائے بیکراں میں۔
جانتا ہوں تو بس اِتنا
کہ کہیں عین درمیان میں ہوں
جہاں کوئی قُطب نُما کام نہیں کرتا۔
ہر قدم اِک نئی سمت ہے
ہر نظر اِک نیا اُفق ہے
اِس وسعتِ لامحدُود میں
سفر محض اِک لفظ ہے۔
یہاں کچھ گُزرا ہے نہ کُچھ آنے والا
کُچھ پیچھے ہے نہ کُچھ آگے
جو ہے سامنے ہے بہر طور سامنے
بہر سمت سامنے سامنے فقط سامنے

میرا

ہمزاد

نفسیاتی

مریض

ہے

میرا ہمزاد نفسیاتی مریض ہے
لیکن یہ بات میں اُسے نہیں بتا سکتا
مَیں اُسے یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ اُس کا مرض
آئے دِن بد سے بدتر ہوتا جا رہا ہے
ایسا نہیں کہ مَیں اپنے ہمزاد سے ڈرتا ہوں
بلکہ اِس لئے کہ مَیں اگر یہ سب اُسے بتا دوں
تو وہ نفسیاتی مریض سے آگے بڑھ کر
پاگل ہو جائے گا اپنے آپ سے باہر ہو جائے گا
مَیں اُس کا عِلاج کر سکتا ہوں
لیکن مَیں اُس کے علاج سے زیادہ اُس کی حالت کے
بد سے بدتر نہ ہونے میں دلچسپی رکھتا ہوں
مَیں اُس کی تمام تر وحشیانہ حرکتوں کو برداشت کرتے ہوئے
اُسے یہ احساس دِلائے رکھنا چاہتا ہوں
کہ وہ کسی نفسیاتی مرض کا شکار نہیں ہے
شاید اِسی طرح اُس کا نفسیاتی مرض
پاگل پن بننے سے بچ جائے
حالانکہ اِس سب کو برقرار رکھنے کے لئے مجھے
وقتاً فوقتاً خود تحلیلِ نفسی کے عمل سے گزرنا پڑتا ہے

یہ کنٹیلی تار

دونوں طرف سے گولی بارُود کی بوچھار ہو رہی ہے۔
سرحد پر لگی ہوئی اِس کنٹیلی تار پر بیٹھا مَیں
اِس طرف جاؤں تو مُشکِل
اُس طرف جاؤں تو مُشکِل
سوچتا ہوں
زاویۂ قائمہ پر اِتنی اُونچی اُڑان بھروں
کہ طرفین نیچے بہُت نیچے رہ جائیں۔
اور اُوپر سے
یہ کنٹیلی تار نظر ہی نہ آئے

آپ بیتی
جگ بیتی

اندر کی بات باہر والوں سے سُن کر
میرے پاؤں تلے زمین کھسک گئی
لیکن یہ جان کر کچھ سہارا ہُوا
کہ سُنانے والا میرے اندر کی نہیں بلکہ اپنے اندر کی
یا شاید کِسی اور کے اندر کی بات سُنا رہا تھا۔
اِدھر کُچھ دِنوں سے
مَیں اپنے اندر کی بات اکثر
دُوسروں کو یہ کہہ کر سُنا دیتا ہوں
کہ یہ میرے اندر کی نہیں
بلکہ کِسی اور کے
اندر کی بات ہے
بوجھ کُچھ ہلکا ہو جاتا ہے۔

مر کے بھی

مَر چُکا ہوں
تابوت میں اُتار دِیا گیا ہوں
تابوت میں آخری کیلیں ٹھوکی جا رہی ہیں
پھِر یہ احساس کی قوّت کیوں نہیں مری
یہ سب دِکھائی کیوں دے رہا ہے
یہ سب سُنائی کیوں دے رہا ہے
موت میں سب ختم کیوں نہیں ہو جاتا
مکمّل بے حِسی کیوں نہیں ہو جاتی
یہ ایک ایک کیل کی چُبھن
محسوس کیوں ہو رہی ہے
یہ درد کیوں ہو رہا ہے
موت میں یہ زِندگی کا درد کیا؟

گولی مارو دُنیا کو

فلاں نامور کھلاڑی کو قومی ٹیم میں جگہ نہیں مِلی۔
فلاں قابِل افسر کو مُناسب کُرسی نہیں مِلی۔
فلاں ہردل عزیز ایم ایل اے کو کابینہ میں جگہ نہیں مِلی۔
فلاں عِلاقے میں کھانا پکانے کے لئے مختص مٹی کا تیل
لاریوں موٹروں میں ڈالا جا رہا ہے۔
فلاں سرکاری محکمے میں رِشوت لے کر
نامناسب اُمیدواروں کو بھرتی کِیا جا رہا ہے۔
وغیرہ وغیرہ ہو رہا ہے جو غلط ہے
نہیں ہونا چاہیئے کیوں ہو رہا ہے۔
سوچ سوچ کر اپنے خون کا دباؤ بڑھا رہے ہو
خواہ مخواہ کی پریشانیاں مول لے رہے ہو۔
اپنی سوچو اپنے ذاتی مسائل کا حل نِکالو
اپنی زندگی کو بہتر بنانے کی سبیل کرو۔
کم سے کم اِتنی تسلّی تو ہو
کہ اپنی پریشانیاں اپنے مسائل سے متعلق ہیں۔

درد کیا چیز ہے
دوا کیا ہے

درد کی اپنی کوئی حیثیت نہیں ہے۔
درد تو محض علامت ہے اُس مرض کی
جو اندر اندر پنپ رہا ہے۔
درد کا عِلاج کرنے سے درد کا عِلاج نہیں ہوگا
مرض ٹھیک نہیں ہوگا
بلکہ مرض کی جڑ پر حملہ کرنا پڑے گا۔
مرض کو جڑ سے اُکھاڑنے والی دوا ڈھونڈنی پڑے گی۔
ورنہ درد کبھی کم ہوگا
کبھی ختم ہوگا
اور کبھی پھِر سے جاگ اُٹھے گا
یوں ہی لمحہ لمحہ
جان لیوا صورت اختیار کرتا ہُوا

طواف اپنا اپنا

مَیں جِس کا طواف کر رہا ہوں
وہ کِسی اور کا طواف کر رہا ہے
وہ جِس کا طواف کر رہا ہے
وہ آگے کِسی اور کے طواف میں ہے۔
وہ کوئی اور جو بھی ہے
اور اُس جیسے ہزاروں لاکھوں بلکہ کروڑوں
شاید اربوں کھربوں
جانے کِس کِس کے طواف میں ہیں۔
شاید یہ سب ہم سب کُل مِلا کر
کِسی ایک کے طواف میں ہیں۔
یا شاید خود اپنے اپنے طواف میں ہیں۔
جو دُوسروں کے اِرد گرد گھومتے ہوئے
بلکہ منڈراتے ہوئے
دراصل خود اپنے ہی اِرد گرد
گھوم رہے ہیں یا منڈرا رہے ہیں۔

راکشسوں کا قبضہ سورگ پر

راکشسوں نے حملہ کر کے
پہلے بھی کئی کئی بار
سورگ پر قبضہ جمایا ہے۔
اِندر دیو اور اُس کی دیوسَینا نے
واپس حملہ کر کے ہر بار سورگ کو چھُڑا لیا
لیکن اِس بار یہ قبضہ کُچھ زیادہ ہی طویل ہو گیا ہے۔
دراصل اب دیوتاؤں میں بھی وہ بات نہیں رہی۔
اِنفرادی سطح پر ہر دیوتا مایا جال کے موہ میں
راکشسوں کا مدِ مقابل بنتا جا رہا ہے۔
اور اِندر دیو تو پہلے سے بھی زیادہ بہت زیادہ
اپسراؤں کے موہ پاش میں گرفتار ہیں۔
شاید اِسی لئے اب سورگ کو چھڑانے کے لئے
برہما وِشنو مہیش
کِسی کی امداد کام نہیں آ رہی

مہاواک

اور روز مرّہ

ہر روز صُبح دم گورُو کا مہاواک
اِس خیال سے سُنتا ہوں کہ اِسے حُکم جان کر
اپنا سارا دِن
اِس میں شامِل ہدایات کے مطابق گزاروں گا
مگر دِن چڑھتے ہی جب میری سوچ
دھوُپ کی تپش میں پِگھل پِگھل کر
دِل دماغ کان ناک ہاتھ پاؤں بلکہ جسم کے
تمام ظاہر و پوشیدہ انگوں سے بہنے لگتی ہے
تو مَیں اَپنی بہتی ہوئی بِکھرتی ہوئی سوچ کو
سمیٹنے میں جُٹ جاتا ہوں
اور پورے کا پورا دِن
اِسی عمل یعنی معمول کے روز مرّہ میں تمام ہو جاتا ہے
مہاواک اَور اُس میں شامِل ہدایات کی تو
گویا مجھے یاد بھی نہیں آتی۔

سائے اُبھر آئے ہیں دیواروں میں

نیند آتے آتے نیند آنے کے بعد بھی
سونے سے پہلے سونے کے بعد بھی
دیواروں میں تصویریں نظر آنے لگتی ہیں
تصویروں میں آدمی جانور چرِند پرِند اُبھر آتے ہیں
آگے آکر جیسے مجھ سے مخاطِب ہونے لگتے ہیں
لڑنے لگتے ہیں جھگڑنے لگتے ہیں
پُرانی پُرانی باتوں کے بہانے
نئے سے نئے مُدعّے اُٹھانے لگتے ہیں
اب تو مجھے نیند سے
بلکہ نیند کے نام تک سے ڈر لگنے لگا ہے
جاگتے ہوئے بھی یہ خوف پریشان رکھتا ہے
کہاں، کِس دیوار سے، کِس فضا سے، کِس گھٹا سے
کونسا سایا اُبھر آئے گا اور میری جانب پیش قدمی کرنے لگے۔

کیا یہی ہے

جنّت

جنت میں نظر بند رہو
شہر پناہ سے باہر مت نِکلو شہر پناہ سے باہر مت جھانکو
شہر پناہ سے آگے مت سوچو
اِس سے آگے دوزخ ہے فقط دوزخ
کِتنی محنت سے کِتنی مُشکِل سے
کِتنی حسرت سے جگہ پائی تھی جنت میں
مگر یہاں زِندگی کرنا کِتنا مُشکل ہے لگ بھگ ناممکن
آج اپنی تمام تر کاوِشوں محنتوں مشقتوں پر رونا آرہا ہے
کہ ہم نے کِس بہشت کے لئے
اپنی تمام آسائیشیں آرائیشیں قربان کردیں
جی میں آتا ہے شہر پناہ کو پھلانگ کر
پھِر اِک بار اُسی بھیڑ میں شامِل ہو جائیں
جِسے جنت کے شہریاروں نے
جہنم کا نام دے رکھا ہے

یہ میرے آنسو

آنسو میری آنکھوں میں پُتلیوں کے عَین پیچھے
جذبات کو ٹھیس پہنچانے والے
کِسی بھی واقعے یا منظر پر
بہہ نِکلنے کو بیتاب رہتے ہیں۔
میری کوشش رہتی ہے
کہ میرے آنسو کِسی پہ ظاہر نہ ہوں۔
اور کِسی کو معلوم نہ ہو
کہ بظاہر چٹان جیسا نظر آنے والا مَیں
دراصل اندر سے بہت کمزور ہوں۔
باہر تو مَیں اکثر سردی زُکام کا بہانہ کر لیتا ہوں
اور گھر میں؟
گھر میں بہ آسانی
پیاز کے چھلکے اُتارنا شروع کر دیتا ہوں۔

طیّارے میرے پیارے

طیّارے میرے پیارے
یہ تم مجھے کہاں اُڑائے لئے جارہے ہو
یہ چاند ستارے یہ نئے نئے سورج منڈل
کائناتیں انگنت خلائیں انجان فضائیں
یہ گھنگھور گھٹائیں
یہ شونیہ بلکہ یہ شونیتا
یہ سب میرے اشتیاق کا مرکز تو ہے
لیکن میری فِطرت کا مرکز نہیں ہے
وہ دُور ایک چھوٹا سا نُقطہ
وہ میری زمین مجھے بہُت یاد آرہی ہے۔
تم نے میری جستجو کو پر تو لگادئے
لیکن مَیں پاؤں کہاں رکھوں
تم نے تو مجھے یہ سوچنے کے قابل بھی نہیں رکھا
کہ مَیں اپنی اُڑان پر ناز کروں
یا اپنے پاؤں اُکھڑنے کا افسوس

کُچھ نیا تو ہوگا

نئی پریشانی کو بھی دیکھ لیں گے
کُچھ نیا تو ہے
نیا ماحول ہی سہی نئے حالات ہی سہی
نیا دِن تو ہوگا نئی رات تو ہوگی
اچھی نہ سہی بُری ہی سہی تبدیلی تو ہے
نئی جنگ ہوگی نئے ہتھیار ہونگے
یُدھ کے نئے ڈھنگ ہوں گے
مزہ آئے گا
اچھا رہے گا بہُت اچھا
چلو اُداسی چھوڑ کر نئی تیاری کریں
نئے جوش سے نئے ولولے سے
نئی ترنگ سے نئی اُمنگ سے

تُمہاری ریڑھ کی ہڈّی

ریڑھ کی ہڈّی کو ہمیشہ سیدھا رکھنے کی
تمہاری عادت مجھے بہُت پسند ہے
اُٹھتے بیٹھتے چلتے پھِرتے بولتے چالتے
محبت بھری نِگاہ سے دیکھتے ہوئے بھی
جِس طرح سے تمہاری ریڑھ کی ہڈّی سیدھی رہتی ہے
اُس سے تمہاری آن تمہاری شان کا اندازہ
اور کِسی کو ہو نہ ہو مجھے تو ہو جاتا ہے
مجھے یقین ہے کہ تم سوتے ہوئے بھی
اپنی ریڑھ کی ہڈّی ضرور سیدھی رکھتی ہوگی۔
تم اپنی ریڑھ کی ہڈّی ہمیشہ یونہی سیدھی رکھنا
اِسے کبھی جھکنے مت دینا۔
کیونکہ اِسی میں تمہاری آن ہے
اسی میں تمہاری شان ہے

میم صاحب کا کُتّا

بڑی حویلی والی میم صاحب کا کُتا بڑا خوبصورت ہے
جو بھی دیکھے فِدا ہو جائے
میم صاحب اُس کے گلے میں
خوبصورت پٹّا باندھ کر رکھتی ہیں
جب بھی باہر جاتی ہیں
پٹّے میں مضبوط زنجیر باندھ کر اُسے ساتھ لے جاتی ہیں
زنجیر کو اپنے ہاتھوں میں اِس طرح کس کر رکھتی ہیں
کہ وہ راہ چلتے ہوئے اِدھر اُدھر مُنہ نہ مار سکے
لیکن میم صاحب کا کُتا جو بہت خوبصورت ہے
موقع پا کر اِدھر اُدھر مُنہ مار ہی لیتا ہے
میم صاحب اُس کی اِس بُری عادت سے بخوبی واقف ہیں
وہ زنجیر کو حسبِ عادت کس کر پکڑے رکھتی ہیں
اور ہر ممکن کوشش کرتی ہیں کہ راہ چلتے ہوئے
وہ اِدھر اُدھر بالکل مُنہ نہ مارے
لیکن بڑی حویلی والی میم صاحب کا کتّا جو بہت خوبصورت ہے
گلے میں بندھی ہوئی کس کر پکڑی ہوئی زنجیر کے باوجود
موقع پا کر اِدھر اُدھر مُنہ مار ہی لیتا ہے

کلپنا کے لئے فرصت کِسے ہے؟

تصوّر کے یا تخئیل کے پروں کی مجھے کیا ضرورت ہے
مجھے تو کلپنا کے لئے فرصت ہی نہیں مِلتی
یہ قبروں کے کتبے یہ خستہ عمارات
یہ خشک ہوتے ہوئے جھرنے
آئے دِن شہر میں وارد ہونے والا
ایک سے ایک نیا پاگل۔
ہزاروں نہیں لاکھوں بلکہ کروڑوں
مناظر ہیں جو اپنی اپنی روداد سناتے ہوئے
میرے سامنے کھڑے ہیں۔
اِس قلیل سی زندگی میں اِتنا بھی وقت نہیں
جو اِن سب کی طرف دھیان دِیا جا سکے۔
اور تم تصوّر کی تخئیل کی بات کرتے ہو
کلپنا کی اُڑان کی بات کرتے ہو؟
اِتنی فُرصت کہاں
اِتنی مُہلت کہاں؟

سُنتے ہو میں تم سے مُخاطب ہوں

پہلے پہل مَیں پانی میں ہی
اپنی خوراک حاصِل کر لیتا تھا
پھِر کُچھ دیر کے بعد کبھی پانی کبھی خشکی
اور پھِر خُشک زمینوں پر مسلسل جنگِ وجود
یعنی غذا حاصِل کرنے کے لئے
کبھی لومڑی تو کبھی شیرِ ببر بننا پڑا
تم جانتے ہو مَیں بَیل اور بھینسا تک بھی بن چکا ہوں
تم یہ بھی جانتے ہو جب مجھے گائے بھینس بننا پڑا
اور جب مجھے دُودھ دوہ لینے کے بعد باہر
زرد صحراؤں میں چرنے کے لئے چھوڑ دِیا گیا
اور مجھے نیچے زمین پر کھانے کو کُچھ نہ مِلا تو مَیں نے اپنی گردن
اِتنی لمبی بڑھالی کہ مجھے زراف تک بننا پڑا
اِس پر بھی جب درختوں کے پھل پھول پتّے
میری پہنچ سے باہر ہونے لگے تو مجھے بندر لنگور تک بھی بننا پڑا
ارے مَیں تو چِڑیا کبوتر فاختہ بلکہ چیل تک بن چُکا ہوں
اور کیا کیا بناؤ گے اُن نعمتوں کو پانے کے لئے
جو تم نے میرے لئے ہی لاکر چھوڑی ہیں

ننگِ وجود

اِک بار سب کے سامنے ننگا ہو چکا ہوں
اب چاہے کِتنے بھی کپڑے پہن لوں
کوئی فرق نہیں پڑے گا
جو ظاہر ہو چکا وہ تو ہو چکا
اب تو کپڑوں میں بھی مَیں
کم سے کم خود کو تو ننگا ہی دِکھائی دیتا ہوں
کپڑوں کے اندر سے جِسم کا ایک ایک عضو
صاف صاف دِکھائی دینے لگا ہے۔
کپڑے تو اب جیسے اپنی ذات کو
دھوکہ دینے کے لئے ہی رہ گئے ہیں
سوچتا ہوں بے لِباس ہو جاؤں
کم سے کم اپنی ذات کو
دھوکہ دینے سے تو بچ جاؤں گا
دھوکہ بھی ایسا جو پوری طرح سے ناکامیاب ہے۔

رام تیرا گورکھ دھندا

مَیں کیا جانوں

تُو کہاں ہے؟
تُو زمیں پر نہیں مِلتا
تو مَیں آسمان کی طرف رجوع کرتا ہوں
تُو وہاں بھی نہیں مِلتا تو مَیں تجھے زمین کے نیچے
اور آسمان سے اوپر ڈھونڈتا ہوں
مگر تُو ہے کہ میرے ساتھ چور سپاہی کا کھیل کھیلتا رہتا ہے
مَیں جانتا ہوں تُو میرے آس پاس ہے
بلکہ میرے ساتھ ساتھ ہے
پھر جب مَیں درد سے کراہتا ہوں
تُو کہاں ہوتا ہے
سامنے کیوں نہیں آتا میرے پاس
میرے ساتھ آ کے کھڑا کیوں نہیں ہوتا
تم میرے پاس نہ ہو کر بھی میرے پاس ہو
یا شاید پتہ نہیں کیا؟
تمہارا گورکھ دھندا تمہیں جانو

عین میری آنکھوں کے سامنے

دیکھتے ہی دیکھتے
عین میری آنکھوں کے سامنے
وہ پورے کا پورا جہاز ڈوب گیا غرق ہو گیا۔
اور مَیں ساحل پر کھڑا کچھ نہ کر سکا۔
مَیں کرتا بھی کیا
مجھے تو خود تیرنا نہیں آتا مَیں کسی کو کیا بچاتا
اور اگر تیرنا آتا بھی
تو بھی کیا مَیں اُس اِتنے بڑے جہاز کو
ڈُوبنے سے بچا سکتا تھا؟
شاید اِسی خیال سے مَیں نے ہاتھ نہیں بڑھایا
شور نہیں مچایا کوئی ہلچل نہیں کی۔
بس دیکھتا رہا دم بخود دم بخود

اپنوں کے درمیان اجنبی

یہ میری آوارگی کا خاصہ ہے یا میری فِطرت کا تقاضا
اکثر کِسی اُجاڑ کِسی بیابان کی طرف نِکل جاتا ہوں
اُدھر خوش رہتا ہوں جِدھر کوئی نہ ہو
اور اگر ہو بھی تو کوئی اپنا نہ ہو
جب کبھی بھیڑ کے درمیان
میری چھٹی حِس جاگ اُٹھتی ہے
تو مَیں کُچھ اَیسا ہو جاتا ہوں
جَیسے میرے آس پاس کوئی نہ ہو بس تنہائی ہو
اِس کیفیّت میں
کوئی دِقّت باقی رہتی ہے نہ کوئی پریشانی
پھر اِردگِرد کوئی اپنا ہو چکا ہے پرایا

اِن کبوتروں کا کیا کروں؟

کبھی کبھی
میرے گھر کے دروازے اور دریچے
اچانک کھُل جاتے ہیں خود بخود
چیں چڑیں دھوم دھڑاک سُن کر
مَیں چونک اُٹھتا ہوں سنسنا اُٹھتا ہوں
مُڑ کے دیکھتا ہوں تو ہر دروازہ ہر دریچہ
اپنی جگہ پر جوں کا توں ہوتا ہے
کئی بار سوچتا ہوں کہ شاید یہ سب میرا وہم ہے
لیکن یہ کبوتر جو چیں چڑیں دھوم دھڑاک سُن کر
پھڑ پھڑا اُٹھتے ہیں
اِدھر اُدھر اُڑ بھاگتے ہیں
اِن کا کیا کروں؟

من بیراگ بھیا

مائی ری میرا اُجاڑوں کی طرف جانے کو جی چاہتا ہے
مَیں جانتا ہوں
ساری رونقیں سارے رنگ
یہیں ہیں بستی میں
مائی ری مَیں یہ بھی جانتا ہوں
کہ وہاں اُجاڑوں میں کچھ بھی نہیں
سِوائے ریت کے ٹیلوں کے
سِوائے کیکر ببُول اور کنٹیلی تھوہر کے
مائی ری پھر بھی مجھے لگتا ہے جیسے وہاں اُجاڑوں میں
کوئی نیا حرف کوئی نیا الِف میرے اِنتظار میں ہے
مائی ری مائی
اب میرا یہاں دِل نہیں لگتا

ہم سب
مایاوی ہیں

ہم سب مایاوی ہیں
اپنے اپنے مایا جال میں پھنسا کر دوسروں کو دھوکہ دیتے ہیں
جو کام فریب کے بغیر نِکل سکتا ہے
اُسے بھی فریب سے نِکالتے ہیں
اپنے آپ کو سب سے بڑا کھِلاڑی سمجھتے ہیں
اور اندر اندر دوسروں کے بھولے پن پر ہنستے ہیں
اپنی عیّاری پر اِتراتے ہیں
جب کہ اصل میں ہم سب مایاوی ہیں
اپنی اپنی مایا کے جال میں پھنسا کر
دُوسروں کو دھوکہ دیتے ہیں
جو کام فریب کے بغیر نِکل سکتا ہے
اُسے بھی فریب سے نِکالتے ہیں

بُڈّھے گھوڑے

دوڑ رہے ہیں

اپنی اپنی عُمر کا اندازہ اِن سب کو ہے
اِنہیں یہ بھی معلوم ہے کہ اب اندر وہ طاقت نہیں ہے
جِس سے خود پر یقین آتا ہے
لیکن یہ بھی جانتے ہیں
کہ جب تک دوڑتے رہیں گے دوڑ میں رہیں گے
جب دوڑنا بند کر دیں گے دوڑ سے باہر ہو جائیں گے
اور ایک بار دوڑ سے باہر ہو گئے تو بے کار ہو جائیں گے
بھُلا دیئے جائیں گے ختم ہو جائیں گے
زِندہ ہوتے ہوئے بھی
مُردوں میں شامل ہو جائیں گے
لٰہذا دوڑ رہے ہیں بے چارے
دوڑ رہے ہیں سرپٹ سرپٹ سرپٹ سرپٹ

ریل کے اُس ڈبّے میں

ریل کے اُس ڈبّے میں
کافی جد و جہد کے بعد بیٹھنے کو جگہ مِلی تھی
پھِر سفر میں لگاؤ سا ہو گیا
دُوسری سواریوں سے بھی ریل کے اُس ڈبّے سے بھی
میرا سفر تمام ہُوا تو اُترتے ہوئے تکلیف ہوئی
بچھڑنے کا ملال اُنہیں بھی تھا جن کا سفر جاری رہا
یا شاید اُنہیں ملال نہیں تھا
بے شک اُن کا سفر میرے سفر سے لمبا ہے
لیکن کبھی نہ کبھی اُن کا سفر بھی تمام ہو گا
اُنہیں بھی اُترنا ہو گا ریل کے اُس ڈبّے سے
اُس وقت اُنہیں بھی تکلیف ہو گی بچھڑنے کا غم ہو گا
اُس وقت وہ بھی وہی کچھ سوچیں گے
جو آج مَیں سوچ رہا ہوں۔

مَیں کِسی کی طرف نہیں دیکھتا

مخالف سمت میں اُڑان بھرتا ہوں
تیز اُونچی ہواؤں میں اپنے پروں کو آزماتا ہوں
ہوا سے کھیلتا ہوں خود سے کھیلتا ہوں مست
اُوپر اور اُوپر اور اُوپر دائرے بناتا ہوں اور اُڑتا ہوں
دائروں کے اندر بھی دائروں سے باہر بھی
مَیں کِسی کی طرف نہیں دیکھتا پھِر بھی
کوئی یہ سمجھتا ہے مَیں یہ سب دِکھاوے کے لئے کرتا ہوں
کوئی سمجھتا ہے مَیں یہ سب
دُوسروں کو جلانے کے لئے کرتا ہوں
کوئی یہ کہتا ہے کہ مَیں اپنے آپ کو
سب سے اشرف ثابت کرنے کے لئے یہ سب کرتا ہوں
کئی تو یہ سمجھتے ہیں کہ مَیں پاگل ہوں
اور یہ سب پاگل پن کے دورے میں کرتا ہوں

توازن

مُدّتوں سے شاید ازل سے
تم میرا استحصال کرتے چلے آ رہے ہو
اور مَیں تمہارے ظُلم و ستم کو برداشت کرتا چلا آ رہا ہوں
میرے یگوں یگوں کے مادۂ برداشت نے
آج میرے اندر اِتنی طاقت پیدا کر دی ہے
کہ مَیں غصّے بھری نظر سے دیکھ لوں
تو پہاڑ کے پہاڑ پھوڑ کر اُن کا سُرما بنا دوں
لیکن مَیں ابھی ایسا کُچھ نہیں کرنا چاہتا
شاید مَیں حتمی مقابلے کے لئے اپنے مادۂ برداشت کی مدد سے
اپنے اندر کچھ اور طاقت بٹورنا چاہتا ہوں
یا شاید مَیں چاہتا ہوں
کہ تم اُس وقت تک میرا استحصال کرتے رہو
جب تک کہ تم ایسا کرتے کرتے تھک نہ جاؤ
یا پھر تمہارے ظُلم و ستم کو برداشت کرنا
میری فِطرت کا ایک جُز وِلازمی بن چُکا ہے
اور مَیں تمہارے اور میرے بیچ کے
توازن کو بِگاڑنا نہیں چاہتا بلکہ بگڑنے نہیں دینا چاہتا

مَیں سرسوتی کا
واہن ہوں

تمہیں وہ دِکھائی دے نہ دے مَیں تو جانتا ہوں
کہ مَیں جہاں جاتا ہوں وہ ساتھ جاتی ہے۔
نہیں نہیں اُسے جہاں جانا ہو
مَیں وہاں جاتا ہوں اُسے لے کر
سرسوتی میرے سر پر سوار رہتی ہے مَیں سرسوتی کا واہن ہوں
تمہیں کئی بار لگتا ہوگا
کہ مَیں عجیب عجیب سمتوں کا سفر کرتا رہتا ہوں
لیکن اصل میں میرا سفر میرے فیصلوں پر نہیں
بلکہ اُس کے فیصلوں پر مبنی ہوتا ہے
دراصل مَیں اُس کا بہُت مشکور ہوں
کہ وہ نئی نئی سمتوں کے سفر میں
مجھے بھی اپنے ساتھ رکھتی ہے۔
یہ اُسی کی مہربانی ہے جو تم کبھی کبھار چاہے طنزیہ ہی سہی
مجھے نئی سمتوں کا سفیر کہہ دیتے ہو۔

اِجتماعی سطح پر بھونکتا۔
ایک دِن گلے کے پٹے سے
کِسی طرح آزاد ہو کر وہ باہر نِکل آیا
بلکہ بھاگ گیا
آوارگی کے عالم میں گلیوں بازاروں
اُس نے دیکھا کہ دودھ ہے نہ کہیں گوشت
کُتّوں کے کھانے کے بِسکٹ ہیں
نہ کہیں رات بسیرے کے لِئے خوبصورت پنجرہ
وہ دُم دبا کر واپس بڑے گھر کی طرف بھاگ اُٹھا
کِسی نہ کِسی طرح پٹہ واپس گلے میں ڈالا
اور یہ اندازہ کرنے کے بعد
کہ اُس کے بھاگنے کا ابھی تک کِسی کو پتہ نہیں چلا
اُس نے بڑے گھر کے ایک ایک فرد کے
پاؤں چاٹنا شرُوع کر دِیئے۔

بڑے گھر کا
خوبصورت کُتّا

گلے میں بندھے ہوئے خوبصورت پٹے والا
بڑے گھر کا خوبصورت کُتا
باہر گھومتے ہوئے آوارہ کُتوں کو دیکھ کر
اکثر سوچتا ہے کاش وہ بھی آزاد ہوتا
اُس کے گلے میں یہ پٹہ نہ ہوتا
وہ بھی گھر گھر کی خبر رکھتا
دوُسرے کُتوں کے ساتھ مِل کر
وہ بھی دوڑتے پھرتے ہوئے

سالا پِچکو سا

سالا پِچکوُ سا وہی گلا سڑا کیڑا کھایا ہوُا اندر اندر سُرنگ جیسا
بڑے دانتوں کے درمیان نظر تک نہ آنے والا دانت
آج پھِر باعثِ درد بنا ہوا ہے۔
ایک مُدّت سے یونہی کبھی کبھار
اِس کی باسی کڑھی میں اُبال آجاتا ہے۔
اور پھِر توبہ رے توبہ
میرا دندان ساز کچھ نہ کچھ دوا دارُو کر کے
ہر بار اِس جان لیوا درد کا عارضی مداوا کر دیتا ہے۔
اور ہر بار اِس بیماری کو
جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے کی صلاح بھی دیتا ہے
تا کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسُری
مگر مَیں ہوں کہ اِس گلے سڑے کیڑا کھائے ہوئے
اندر سے سُرنگ جیسے باعثِ درد بے کار دانت کو
اپنے جسم سے الگ کرنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوتا

فرائیڈ یہ کیسا خواب ہے؟

جھیل کنارے وہ کشتی مجھ سے مخاطب ہوئی
''آیئے صاحب تھوڑی دیر کے لئے ہی سہی آیئے نا
دُور دُور تک پھیلے ہوئے پانیوں کی سیر کراؤں گی
ڈریئے مت آجایئے''
مَیں بادلِ ناخواستہ سوار ہو گیا۔
اچانک مَیں تہ در تہ غوطے کھانے لگا۔
ہچکولے کھانے کے بجائے
مَیں ڈُوب ڈُوب جانے لگا
پانی میری نس نس میں بھر چکا تھا
اور مَیں بے ہوش و حواس تھا۔
جب اچانک مجھے معلوم ہوا
کہ مَیں جھیل کے دُوسرے کنارے پر اُتر رہا ہوں۔
کشتی پھر مجھ سے مخاطب ہوئی
''صاحب مَیں نے آپ کو ڈبونے کے لئے نہیں
بلکہ پار لگانے کے لئے دعوت دی تھی

کیا دِن تھے

کہیں بھی کسی بھی غار میں سر چھپا لیتے تھے۔
کچھ دیر رُک کر پھِر چل دیتے تھے
اونچے اونچے درختوں پر لمبی لمبی اُڑانوں جیسی
چھلانگیں لگاتے ہوئے
دیکھتے ہی دیکھتے کوسوں دور نِکل جاتے تھے۔
زحمتِ سفر کی چِنتا نہ منزِل کی فِکر
زمینوں پر قبضوں کے جھمیلے نہ گھروں میں چوری چکاری کا ڈر
ہاتھ میں ایک عصا ہوتا تھا سہارا بھی لاٹھی بھی
چرِند و پرِند کی زبان عام فہم تھی
ہماری زبان بھی سب سمجھتے تھے
ہر شَے کِتنی سیدھی سادی تھی
دوست دُشمن کی پہچان کِتنی آسان تھی
اب تو گھر زمین سفر زحمتِ سفر
منزِل فیشن دوست دُشمن اپنے پرائے چرِند و پرِند
سب چِنتا کا باعث سب کوفت ساماں سب خوف ساماں
کاش یہ کینچلی اُتار کر آزاد ہو سکیں
کاش پھِر سے آدی باسی ہو جائیں۔

شعور کی رو

بُری سے بُری سوچ بُرے سے بُرے کام
غلاظت سے بھرے ہوئے گندے گندے خیالات۔
بھڑکیلے کپڑے پہن کر
کئی بار تو ننگے بدن بازار میں نِکلنا۔
دُوسرے لوگوں کو خاص طور سے عورتوں کو
ننگے بدن بازار میں گھومتے ہوئے دیکھنا
دُوسری عورتوں کے ساتھ شوہر کی طرح رہنا
اپنے آنگن کے درخت پر چڑھ کر
پڑوسیوں کے زنان خانوں میں جھانکنا
اُس قِسم کی عورتوں کی سیڑھیاں چڑھنا
کِسی اور کی دولت کو دِل کھول کر اُڑانا وغیرہ وغیرہ
بہت خراب بہت گندے خواب آنے لگے ہیں۔
کہیں یہ سب میرے لاشعور میں دبی ہوئی
اُن خواہشوں کا کمال تو نہیں
جنہیں غیر ضروری سمجھ کر مَیں نے پورا نہیں کِیا
یا جنہیں پورا کرنا مَیں نے مناسب نہیں سمجھا
یا جنہیں مَیں چاہ کر بھی پورا نہ کر سکا

بند گلیوں کا راز

دُور سے بند ہوتی ہوئی دِکھائی دینے والی جس گلی پر
تم نے قدم بڑھانے کا اِرادہ یہ سوچ کر ترک کر دِیا
کہ وہ تمہیں کہیں نہیں پہنچائے گی
وہ گلی دراصل تھوڑا سا آگے جا کر دونوں طرف سے
ایک بڑی شاہ راہ میں کھُلتی ہے
وہ شاہراہ جو دونوں طرف سے
آگے جا کر کئی شاہراہوں سے جا مِلتی ہے
تُم نے ایسی ہی
دُور سے بند ہوتی ہوئی دِکھائی دینے والی
اور آگے جا کر دونوں طرف سے
شاہراہوں میں کھلنے والی کئی ایک گلیوں پر
قدم بڑھانے کا اِرادہ ترک کر دِیا ہوگا
یہ سوچ کر کہ وہ تمہیں
کہیں نہیں پہنچائیں گی

ہم کتنے مجبور ہیں

ہم جن لوگوں کو ہمیشہ بُرا سمجھتے ہیں بُرا کہتے ہیں۔
جب اُن کے دربار میں
جی حضوری کے لئے
حاضری دینی پڑتی ہے
تو اندر اندر بہت کوفت ہوتی ہے
تکلیف ہوتی ہے
لیکن پھر بھی جانا پڑتا ہے جاتے ہیں
جی حضوری کرتے ہیں اُن لوگوں کی
جنہیں ہم
ہمیشہ بُرا سمجھتے ہیں اور بُرا کہتے ہیں

کبیرا کھڑا بازار میں

مَیں لسّی بھی پی لیتا ہوں کولڈ ڈرِنک بھی
کب لسّی پیتا ہوں کب کولڈ ڈرِنک کُچھ طے نہیں ہے
جب لسّی مِل جائے لسّی پی لیتا ہوں
جب کولڈ ڈرِنک مِل جائے کولڈ ڈرِنک پی لیتا ہوں
شاید موڈ کی بات ہے
جب لسّی کا موُڈ ہو لسّی پی لی
جب کولڈ ڈرِنک کا موُڈ ہو کولڈ ڈرِنک
ہاں ویسے مَیں نے اِس معاملے پر کبھی غور بھی نہیں کِیا
شاید ضرورت ہی نہیں محسوس ہوئی غور کرنے کی
یہ تو بس آج یونہی خیال آ گیا تھا
اور ہاں ایک اور بات کا خیال بھی آیا
خیال نہیں شاید یاد آئی
کہ لسّی آجکل بہُت کم دستیاب ہے
اور کولڈ ڈرِنک یہاں وہاں ہر جگہ مِل جاتی ہے

تخلیقی عمل

باہر لوٗ چل رہی تھی
اندر اُمس سے دم گھُٹ رہا تھا
گرمی سے گویا سینے میں کوئی الاؤ جل رہا ہو
سمجھ میں نہیں آ رہا تھا
اِس جان لیوا موسم سے کیسے جان چھُڑائی جائے
پنکھا تو پنکھا اے سی بھی بے کار ثابت ہو رہا تھا
اچانک ایک نظم شاید یہی نظم
جانے کہاں سے اُڑتی ہوئی آئی
جانے کِس کھِڑکی سے اندر داخِل ہوئی
ٹھنڈی ٹھار ساون کی پھوہار
درجۂ حرارت یکلخت نیچے اور نیچے
اور نیچے اور نیچے اور نیچے اور نیچے

ترِنیتر

دونوں آنکھیں بند ہوتے ہی تیسری آنکھ کھُل گئی
بدن تمام گویا بصیرت ہو گیا
چہار سمت بلکہ شش جہات نظر ہی نظر بینائی ہی بینائی
ایک دُنیا میرے اِرد گرد اُوپر نیچے
دائیں بائیں چکّر لگا رہی ہے
مَیں زمین کے عَین مرکز میں ایک نقطۂ موہوم
اور دھرتی تمام چکّر میں
اور سوُرج بمع اپنی تمام تر زمینوں کے گھومتا ہوُا
اور پھر میرے اِرد گرد
میری نظر کے سامنے
لاکھوں کروڑوں سوُرج چاند ستارے گھومتے ہوئے
اور مَیں اِس پوری کائنات کے عَین مرکز میں
ایک نقطۂ موہوم

چھوٹے بڑے خواب

بڑے خواب بھی ہیں نا!
اندر رکھّے ہیں سنبھال کر
پردے میں سب سے چھپا کے
دُنیا کو دِکھانے کے لِئے یہ چھوٹے چھوٹے خواب ہیں نا!
دُنیا یہ سمجھتی ہے
کہ ہم چھوٹے چھوٹے خوابوں کی تکمیل میں مگن ہیں
اور ہم چپکے چپکے اندر اندر
اپنے بڑے خوابوں کی تکمیل کے لِئے کوشاں ہیں
کیا؟ ہم اَیسا کیوں کر رہے ہیں؟
ارے بھائی! یہ جو دُنیا ہے نا!
یہ ہمارے بڑے خوابوں کو برداشت نہیں کر پائے گی
جل جائے گی ٹوٹ پھوٹ جائے گی چکنا چور ہو جائے گی
اور ہم نہیں چاہتے کہ یہ بے چاری جل مرے
ٹوٹ پھوٹ جائے چکنا چور ہو جائے
کیونکہ اِسی دُنیا پر تو
ہمارے بڑے بڑے خوابوں کی تکمیل
انحصار کرتی ہے

یا اپنے اپنے مفاداتِ خصوصی کی وجہ سے
یہ لوگ ایک دوسرے کو
میرا پیٹ پھاڑنے سے باز رکھتے ہیں
میرے سب کے سب چاہنے والے
اپنے آپ کو ایک دوسرے سے
زیادہ چالاک سمجھتے ہیں
اور مَیں؟
مَیں اِن سب کو سونے کے انڈے دے دے کر
اِنہی سے خود کو محفوظ رکھتا ہوں
چَین کی سانس لیتا ہوں
آرام کی نیند سوتا ہوں
وہ سب سمجھتے ہیں کہ وہ میرا استحصال کر رہے ہیں
جب کہ دراصل مَیں ہی
اِن سب کا استحصال کر رہا ہوں
سب کو باری باری
سونے کے انڈے دے دے کر

پرسپر راجنیتی

مَیں سونے کے انڈے دینے والا مُرغا ہوں
یا شاید مُرغی ہوں
میرے چاہنے والے
میرے دِیئے ہوئے انڈوں سے
وقتاً فوقتاً فیض یاب ہوتے رہتے ہیں
میرے کُچھ ایک چاہنے والے تو
میرا پیٹ پھاڑ کر
سارے کے سارے سونے کے انڈے
ایک ہی بار برآمد کر لینا چاہتے ہیں
لیکن باہمی مصلحتوں کی وجہ سے

ایک اُتسو ہو ایسا

کتنی دیوالیاں کتنی بیساکھیاں کتنی ہولیاں کتنی لوہڑیاں
کتنے بسنت کتنے چیت پھاگ آئے اور چلے گئے
ہر اُتسو آتے ہوئے اپنے ساتھ لایا جوش جوانمردی
ڈھول ڈھما کہ ناچ گانا ذوق وشوق رنگ گُلال
آتش بازی پتنگ بازی جلسہ جلوس
اور جاتے جاتے پیچھے چھوڑ گیا
وہی بے یقینی وہی کمتری وہی کم مائگی وہی خلا وہی ویرانی
ضرورت ہے ایک ایسے اُتسو کی
جو آئے تو پھر واپس نہ جائے
اور اگر جائے تو جاتے ہوئے
ڈھول ڈھما کا ناچ گانا رنگ گُلال آتش بازی پتنگ بازی
اپنے ساتھ نہ لے جائے
اور اگر یہ سب اپنے ساتھ لے جائے
تو کم سے کم بے یقینی کم تری کم مائگی
خلا اور ویرانی پیچھے نہ چھوڑ جائے
بلکہ یہ سب بھی اپنے ساتھ لے جائے

آسمان میری طاقت ہے

آسمان میری طاقت ہے میرا حوصلہ ہے
مَیں جب بھی کسی گھُٹن بھرے کمرے میں
بند ہو جاتا ہوں
تو کسی کھِڑکی کسی دروازے
یہاں تک کہ کسی روزن سے
آسمان کی طرف جھانک کر
لمبی سانس لے لیتا ہوں
کئی بار تو دردریچے کھول کر
کھُلے آسمان کی طرف بھاگ اُٹھتا ہوں
دردریچے نہ ہوں تو دیوار توڑ کر
کھُلے آسمان تلے پہنچ جاتا ہوں
اور بھرپور لمبی سانس لیتا ہوں
چین کی سانس

خواب کیا دِکھاتے ہیں
خواب کیا دِکھائیں گے

کُچھ عمارتیں کُچھ کھنڈر خرابے
کُچھ شہر گاؤں کُچھ دریا پہاڑ
کبھی جو زیرِ پا تھے آج نہیں ہیں
اپنی یاد دِلاتے ہیں پُکارتے ہیں بُلاتے ہیں
مُجھے ڈھونڈتے ہیں
یہ سب خوابوں میں اکثر میرے ساتھ ہوتا ہے۔
یہ عمارتیں یہ کھنڈر خرابے یہ کوہ و دمن یہ دریا یہ پہاڑ
آج مَیں جِن میں ہوں جو مجھ میں ہیں
کِسی رات خواب میں نہیں آتے۔
آئیں گے یہ بھی میرے خوابوں میں آئیں گے
بُلائیں گے پکاریں گے مجھے ڈھونڈیں گے
جب یہ بھی زیرِ پا نہیں ہوں گے
شاید جب کچھ بھی زیرِ پا نہیں ہوگا
جب کچھ بھی میرا نہیں ہوگا زندگی بھی

مَیں وہاں نہیں ہوں مَیں یہاں ہوں

دُنیاداری
پُرکاری
ہُشیاری
فن کاری
عیّاری
یہ سب تو باہر ہے
مَیں باہر نہیں ہوں
مَیں تو اندر ہوں۔
اندر فقر ہے
مستی ہے
مَوج در مَوج
بے باکی ہے
لاتعلّقی ہے
لایعنیت ہے
اندر سب روشنائی ہے باہر سب اندھیار
اندر میری جیت ہے باہر میری ہار

پار
اپار

کبھی کبھی کوئی نُقطہ دیکھتے دیکھتے پھَیل جاتا ہے
کیسی کیسی شکلیں اِختیار کر لیتا ہے
کبھی دائرہ کبھی تِکون کبھی ستارہ کبھی چاند کبھی سوُرج
کبھی کبھی کوئی نُقطہ نظر کے کمزور ہونے کی وجہ سے بھی
پھَیلا ہوُا دِکھائی دیتا ہے
اور کبھی کبھار کم بہُت ہی کم
دیکھنے والے کی نظر میں دھیان کی شکتی
ایسی کمال کی ہوتی ہے کہ جو کِسی نقطے کو پھَیلا کر
کھنڈ منڈل برہمنڈ لوک پرلوک بنا دیتی ہے
کبھی کبھار کِسی ایسی ہی نظر کی طاقت
کِسی نُقطے کو موجود سے غیر موجود کر دیتی ہے
اور ایسے میں ایسی نظر
غیر موجود نُقطے کے پیچھے چھُپے ہوُئے
کھنڈ منڈل برہمنڈ لوک پرلوک
بلکہ اُس سے پرے کی کائنات کو بھی دیکھتی ہے

ایک مچھّر میرے ٹخنے کے پاس

ایک مچھّر میرے ٹخنے کے پاس
میرا خون چوستا ہُوا پکڑا گیا۔
میرے ہاتھ کی ایک رگڑ سے بے چارہ جان سے گیا
وہ آرام سے میرا خون چوستا رہتا
اگر میری نظر اُس پر نہ پڑی ہوتی
اور میری نظر اُس پر اُس وقت پڑی
جب مجھے اپنے ٹخنے کے پاس
کانٹے کی چُبھن جیسا درد محسوس ہُوا۔
یہ کانٹے کی چُبھن جیسا درد اگر مُجھے محسوس نہ ہوتا
تو شاید مَیں بے فِکر رہتا
نہیں نہیں شاید وہ مچھّر بے فِکر رہتا
میرا خون چوسنے میں مصروف۔

بُلّہ کی جاناں
مَیں کون

جب مَیں کشمیر میں تھا کشمیری تھا
ہجرت کر کے بنگال چلا گیا بنگالی ہو گیا
پنجاب گیا پنجابی ہو یا
پھر گُجرات آسام کرناٹک مہاراشٹر
اور جانے کہاں کہاں نسل در نسل
میرے وطن اور میری وطنیت میں تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں
اِدھر سُنا ہے میرے بُزرگ اور اُن کے بُزرگ
شاید ہمالیہ جیسے پہاڑوں کو چیرتے ہوئے
خشکی کے راستے کہیں دُور دیش سے آئے تھے۔
مَیں کون ہوں کہاں سے ہوں
مَیں اِس بارے میں بالکل فِکر مند نہیں ہوں
لیکن اُن کو کیا جواب دُوں
جو قدم قدم پر پوچھتے ہیں
تُم کون ہو؟ کہاں سے ہو؟

اِنسان
دراصل
اِک جانور
ہے

کھُجلی ایک فِطری عمل ہے
کھُجلانا بھی ایک فِطری عمل ہے
چمڑی بھی اپنی ہے
ناخُن بھی اپنا ہے
وہ وحشت بھی اپنی ہے
جو کھُجلی پر حملہ کرنے کی کوشش میں
چمڑی پر حملہ کردیتی ہے
چمڑی کو زخمی کردیتی ہے
کھُجلی کو ناسُور تک بنا دیتی ہے

اچانک حملے کے جواب میں مَیں بس اِتنا ہی کہہ سکا
''شاعری سے کُچھ نہیں ہوتا
اِس سے بہتر ہے جاؤ، کسی بنجر کھیت میں ہل چلاؤ
فصل اُگاؤ درخت لگاؤ زرد زمینوں کو سرسبز بناؤ''
اِس بار اُس کے بولتے بولتے مَیں نے کچھ لمحے چُرا لئے
اور پُوری طرح سوچ کر جواباً کہا
''وہی تو کر رہا ہوں
بنجر زمینوں میں ہل چلا رہا ہوں
درخت لگا رہا ہوں زرد زمینوں کو زرخیز بنا رہا ہوں''
''غلط فہمی میں ہو غلط زمینوں میں ہل چلا رہے ہو
بیوقوف ہو تمہارا کچھ نہیں ہو سکتا''
یہ سب کہتے ہوئے وہ میرے سامنے
پھِر سے روشنی کی ایک کِرن میں بدل گیا
اور وہ کرن جِس روشن دان سے اندر آئی تھی
اُسی سے باہر چلی گئی۔

شیکسپیئر

میرے خواب میں

مَیں کارِلوح وقلم میں مصرُوف تھا کہ اچانک
روشن دان سے روشنی کی ایک کرن اندر آئی
اور آتے ہی ایک بزرگ وارِ سفید ریش میں بدل گئی
سینہ تان کر وہ مُجھ سے مخاطب ہوا ''یہ کیا کر رہے ہو؟''
''شاعری'' کُچھ سوچنے سے پہلے ہی
جواب میرے مُنہ سے نکل گیا۔
وہ پھِر تن کر بولا ''شاعری سے کیا ہوتا ہے؟''
''کُچھ تو ہوتا ہی ہوگا کُچھ تو ہوگا ہی''

کہکشاں
در کہکشاں

راہ میں جو بھی ستارہ آئے
اُس کی چمک سے اپنی آنکھوں کو چمکاتے چلو
یہ نہ سوچو کون اپنے اندر کی آگ سے شُعلہ ساماں ہے
کون کِسی دوسرے کی آگ میں جل رہا ہے
کِس کی چمک محض کِسی اور کی روشنی کا عکس ہے
کون جلتی ہوئی ہواؤں کے بجھنے سے
ابھی ابھی ٹھوس حالت میں نمودار ہوُا ہے
کون کِسی دوسرے سے ٹکرا کے
ابھی ابھی لخت لخت ہوُا ہے
سیر کرتے چلو
بس گزرتے چلو
راستے میں بلکہ اپنے اِرد گرد
ہونے والی آتش بازی سے
تفریح کرتے رہو
کہکشاں در کہکشاں

اِک نئی راہ

پگڈنڈیاں برف کے نیچے دب گئیں تو کیا
شاہراہیں بارشوں میں بہہ گئیں تو کیا
نقوشِ پا آندھیوں میں بکھر گئے تو کیا
پہنچنا تو وہاں تک ہی ہے نہ
تم چل پڑو
سمتِ سفر کے انداز سے
قدم اُٹھاؤ پکّے اِرادے سے
راہ خود بخود نکل آئے گی
تمہارے لِئے ہی نہیں
بلکہ پیچھے آنے والوں کے لِئے بھی
تمہارے نقوشِ پا
خود سمتِ سفر کا پتہ دیں گے

رام کبیرا ایک

بھئے ہیں

صدیوں بلکہ یگوں پر پھیلے ہوئے
تُمھارے سفر کے دھیان میں رہتا ہوں
آسماں در آسماں دُنیاؤں میں کائناتوں میں
خلاؤں میں ہواؤں میں فضاؤں میں
تُمھارے وہ نقُوشِ پا ڈھونڈتا ہوں جو بظاہر نظر نہیں آتے
مگر مَیں اپنے تصوّر میں اُنہیں دیکھتا ہوں
اُن پر چلنے کی کوشش کرتا ہوں
کبھی کبھی تو مُجھے اپنے نقوُشِ پا ہی
تُمھارے نقوُشِ پا کا عکس معلوم ہوتے ہیں
کہیں کہیں تو مجھے ایسے لگتا ہے گویا میرا پاؤں
تُمھارے نقشِ پا پہ کُچھ اِس طرح آن پڑا ہے
کہ دونوں نقوُشِ پا ایک ہوگئے ہیں
مَیں تُم ہوں یا نہیں
مگر تمھارے راستے پر تو چل رہا ہوں
اور ایسے میں کبھی کہیں
توارد کا ہو جانا ممکن ہے بہت ممکن

مُجھے وہاں ڈھونڈا کرو

مَیں کہاں ہوتا ہوں؟
مَیں تو بہ یک وقت کئی کئی جگہوں پر موجود ہوتا ہوں
چُوچُو میں بُلبُل میں کیوُٹی میں
رِدُو میں چارُو میں چِنٹو میں مِنٹو میں
پپّوُ میں ڈبُّو میں
ارے مَیں تو اِن کے ماں باپ
بلکہ اُن کے بھی
باپ دادا میں موجود رہتا ہوں
یہی نہیں مَیں تو کئی ہرن ہرنیوں اور اُن کے بچّوں
بلکہ کئی کچھوے خرگوشوں تیتر بٹیروں
اور کبوُتر کبوُتریوں میں موجود ہوتا ہوں
تُم مُجھے وہاں ڈھونڈتے ہو
جہاں مَیں تمہیں دِکھائی دیتا ہوں
بیوقوف! مُجھے وہاں ڈھونڈا کرو
جہاں مَیں تُمہیں دِکھائی نہیں دیتا

میرے بعد

قرطاس پر تحریر شُدہ میری تخلیقات
دُنیا پڑھتی ہے پڑھتی رہے گی
لیکن میری وہ نظمیں کون پڑھے گا
جو مَیں نے ہواؤں پر فضاؤں پر تحریر کی ہیں
میرے وہ اشعار کوئی کیسے پڑھے گا
جو مَیں نے پانیوں پر منقّش کِئے ہیں۔
میری متعدد شِعری تخلیقات جو
اونچے پہاڑوں پر جمی ہوئی برف پر
اور سمندروں سے اُٹھ اُٹھ کر
تیز رفتار میں دُور دُور اُڑتے پھرتے بادلوں پر منعکس ہیں
اُن کا کیا ہوگا
میرے اندر موجود بے اِنتہا شِعری کلام
جس کا ایک بہت چھوٹا حِصّہ میری زندگی میں باہر آسکے گا
میرے بعد اُس کا کیا ہوگا

ہم جو زیادہ ہیں بہت زیادہ

ہم سب جس کے اندر تھے
اُونچی چوٹی پر بنا ہُوا لکڑی کا وہ مکان جل رہا تھا
ہم جو زیادہ تھے جان بچا کر نکل آئے
وہ جو کم تھے شانت رہے اٹل رہے
جل گئے راکھ ہو گئے مگر گھبرائے نہ بھاگے
ہم جو زیادہ تھے زیادہ ہیں
پشچاتاپ میں وہاں جاتے ہیں
وہ گھر دیکھنے
نہیں نہیں وہ شُعلے دیکھنے
نہیں نہیں وہ راکھ دیکھنے
نہیں نہیں وہ جگہ دیکھنے جہاں کبھی وہ مکان تھا
نہیں نہیں وہ شُعلے تھے
نہیں نہیں وہ راکھ تھی
اب کُچھ نہیں ہے
یاد ہے پچھتاوا ہے اور ہم ہیں
ہم جو زیادہ ہیں بہت زیادہ

آتم پرکاش

کبھی کبھار اپنی رتن کوٹھڑی کھولتا ہوں
رتن صندوقڑی کھول کر تسلّی کر لیتا ہوں
کہ سارے لعل و جواہر اپنی اپنی جگہ پر موجود ہیں
پھر باہر آ کر دروازہ بند کر دیتا ہوں تالا لگا دیتا ہوں۔
آج داخل ہوتے ہی مَیں نے دیکھا
کہ رتن کوٹھڑی میں جگہ جگہ جالے پڑے ہوئے ہیں
دیواروں کا رنگ روغن اُکھڑ رہا ہے
ہوا میں آلودگی ہے
آج صندوقڑی کھولنے کا دِل ہی نہیں ہوا
آج مَیں نے فیصلہ کِیا بلکہ عہد کِیا
کہ رتن کوٹھڑی کے سارے جالے صاف کروں گا
دیواروں پر نئے سِرے سے رنگ روغن کرواؤں گا
رتن کوٹھڑی کے ماحول کو
گھُٹن اور آلودگی سے نجات دِلانے کے لئے
آج مَیں نے دروازے پر تالا نہیں لگایا
بلکہ دروازہ بند ہی نہیں کیا کھُلا چھوڑ دیا

گاڑی بُلا رہی ہے
سیٹی بجا رہی ہے

بچپن سے
جب کسی ریل گاڑی کی سیٹی کی آواز
میرے کانوں میں پڑتی تھی
تو مجھے لگتا تھا گویا گاڑی چھوٹ گئی
اور مَیں پیچھے رہ گیا
بچپن گیا جوانی آئی بڑھاپا آیا
کئی ریل گاڑیاں آئیں
اپنی اپنی سیٹی بجاتی ہوئی آگے بڑھ گئیں
مَیں جہاں تھا وہیں کھڑا رہا
اب تو زندگی کی ریل گاڑی ہی
سیٹی بجاتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے
اور مَیں پیچھے چھوٹ رہا ہوں
اب کسی ریل گاڑی کے
سیٹی بجاتے ہوئے آگے بڑھ جانے سے
مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوتی

چین اِس کو کبھوُ نہیں آتا

تھک ہار کے بیٹھا اُونگھتا رہتا ہوں
کبھی تحت الشعوُر کے کم گہرے
تو کبھی لاشعوُر کے زیادہ گہرے پانیوں میں
غوطے کھاتا رہتا ہوں
اکثر ڈوُب ڈوُب جاتا ہوں
کُچھ سوچ ہے نہ اختیار
جو ہورہا ہے خود بخود ہورہا ہے
مَیں تو بس چین کی نیند سو جانا چاہتا ہوں
مگر یہ جو میرا ہمزاد ہے
خود چین کی سانس لیتا ہے نہ مُجھے لینے دیتا ہے
کُچھ نہ کُچھ سوچتا رہتا ہے
لمحہ لمحہ بے قرار لمحہ لمحہ برسرِ پیکار
لمحہ لمحہ شمشیر بدست
تحت الشعور یا لاشعور کی وادیوں کی طرف
جانے کا تو نام ہی نہیں لیتا
مُجھے بے شعور گردانتا ہے
اور خود بڑا باشعور بنا پھرتا ہے

مُجھے میری نظموں سے بچاؤ

یہ کالی پیلی سُرخ و سفید کاسنی گاجری
کڑوی کسیلی اُجلی مٹیالی نظمیں
قدم قدم پر میرے سامنے تن کر کھڑی ہو جاتی ہیں
میرے ساتھ ساتھ چلنے لگتی ہیں اُچھلتی کودتی
پھِسلتی پھُدکتی چہکتی مہکتی مچلتی بُدکتی ہوئی
مُجھے ساتھ لے لو مُجھے ساتھ لے لو
مُجھے پہلے لِکھ لو مُجھے پہلے لِکھ لو
اوئے مَیں گر گئی اوئے مَیں پیچھے رہ گئی
یہ میری نظمیں یہ پگلائی ہوئی نظمیں
یہ مُجھے بھی پاگل کر دیں گی
مَیں اپنی ان نظموں کے ہجوم میں
گھِر گیا ہوں، پھنس گیا ہوں
ان کے پیروں تلے کُچلا جا رہا ہوں
اِن کے نیچے دبا جا رہا ہوں
اور میرے اوپر یہ نظموں کا انبار
اونچا اور اونچا ہوتا جا رہا ہے
یا شاید اپنی میرے سر سے اونچا اور اونچا ہوتا جا رہا ہے

برہمارتھ

لُغت دیکھتے دیکھتے
عُمر گُزر گئی
لفظ کی سمجھ نہ آئی
اور جب آخرِ شب
لفظ کے معنی
اندر سے پھوٹ نکلے
انکوُر کی مانند
تو لُغت
غیر اہم ہو گئی

تارے

چمکتے ہوئے ٹمٹماتے ہوئے
روشن روشن جگمگ جگمگ
بے چارے

دُور سے بہت خوبصورت دِکھائی دینے والے
یہ ستارے دراصل بے چارے
اپنے اپنے اندر
جلتے ہوئے پگھلتے ہوئے ابلتے ہوئے ہیں
سارے کے سارے
کوئی اپنی ہی آگ میں جلتا ہُوا
کوئی کِسی دوسرے کی آگ میں جلتا ہُوا
کوئی گرم ہواؤں کا طوفانی گولا
کوئی گرم لاوے کا پگھلتا ہُوا مادّہ
کوئی پرچھائی کی طرح
دوسروں کے درمیان سے بے اثر گذر جانے والا
کوئی اپنے ہی اُبلتے ہوئے سیلاب میں بڑ بڑاتا ہُوا
کوئی دُور دُور تک پھیلے ہوئے بے حِس صحرا جیسا
تو کوئی چٹیل کُھردرے بے آب پہاڑی سلسلے جیسا
یہ تارے سارے کے سارے بے چارے

مصنّف کی دیگر تصانیف :-

۱۔ پیش خیمہ (شِعری مجموعہ ۱۹۸۰ء)

(جموں کشمیر کلچرل اکادمی ایوارڈ ۱۹۸۲ء)

۲۔ سراب در سراب (شِعری مجموعہ ۱۹۸۴ء)

۳۔ خودرنگ (شِعری مجموعہ ۱۹۹۵ء)

۴۔ کیکٹس اور گلاب (شِعری مجموعہ بحروفِ دیوناگری ۱۹۹۹ء)

۵۔ دی تھرڈ سٹرینڈ (The Third Strand) (۱۹۹۹ء)

مصنف کی نظموں کا انگریزی ترجمہ ناشر (Writers' Workshop Calcutta)

۶۔ موجِ ریگ (شِعری مجموعہ ۲۰۰۳ء)

بھارتی بھاشا سمان (۲۰۰۴-۰۵)

سینٹرل انسٹی چیوٹ آف اِنڈین لینگو یجز، میسور

۷۔ نظم اکیسویں صدی (مجموعہ نظمیات ۲۰۰۸ء)

یوپی اُردو اکادمی ایوارڈ (۲۰۰۹ء)

۸۔ شہرِ غزل (شِعری مجموعہ بحروفِ دیوناگری ۲۰۰۸ء)

ہندی تر بھاشی لیکھک پُرسکار 2009

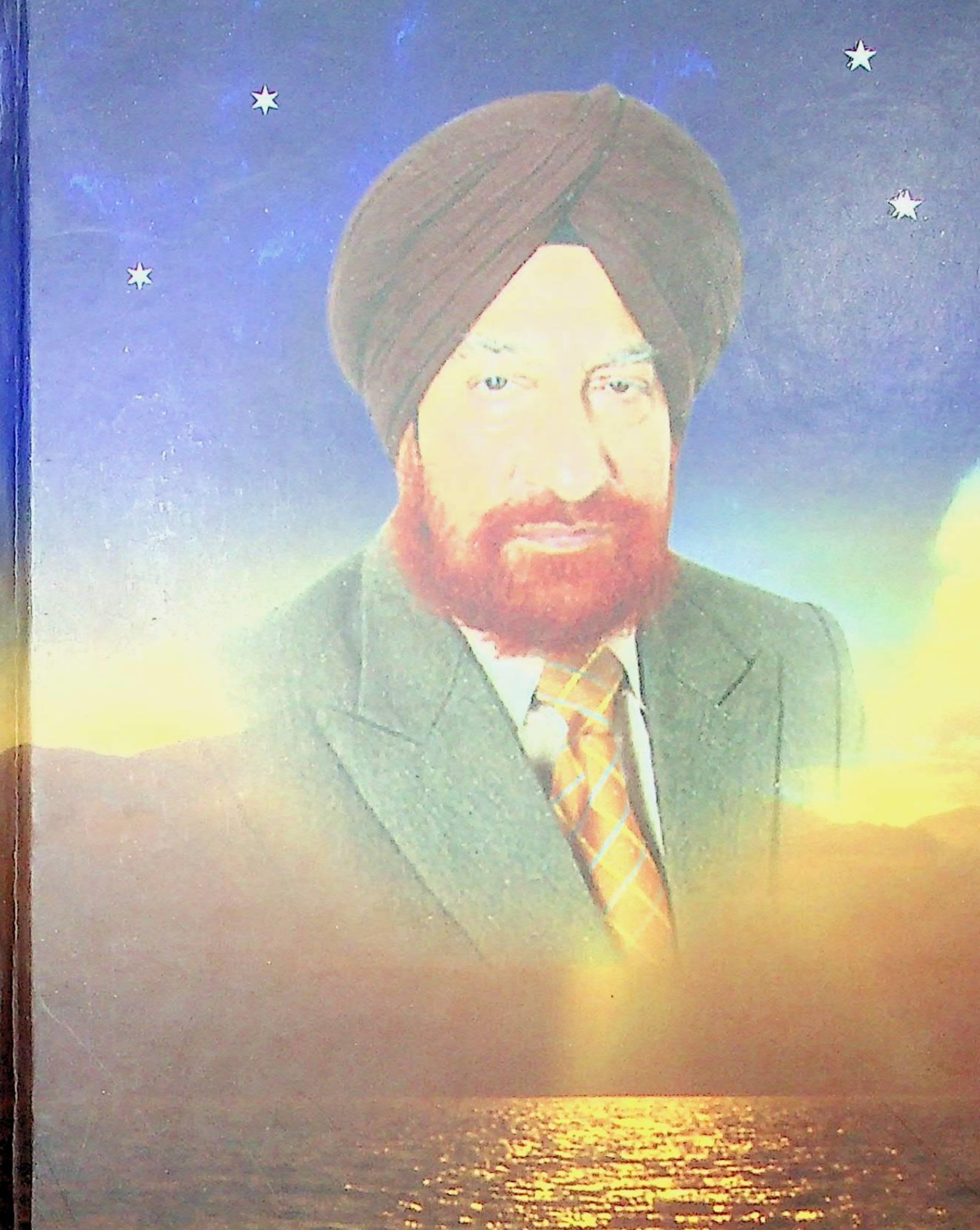
(سینٹرل ہندی ڈائریکٹوریٹ مِنسٹری آف ہیومن رِسورسز، گورنمنٹ آف اِنڈیا)

زیرِ ترتیب :-

۱۔ میرے حصّے کی دُنیا (سوانحِ عُمری)

۲۔ سینڈ وِچ اینڈ ادر پوئمز

(مصنّف کی نظموں کا انگریزی ترجمہ، مترجم جناب بیدار بخت اور محترمہ میری اَین - کینیڈا)



اے میرے خُدا مُجھ کو یہ توفیق عطا کر
جو دِل پہ گُزرتی ہے وہ اِظہار میں آوے

(پرتپال سنگھ بیتاب)